بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

کلمات بسم اللہ پر صوفیانہ نکات

بسم اللہ کے کلمات چار ہیں

بسم اللہ کے اندر چار کلمے ہیں:

1۔بسم،2۔اللہ۔الرحمٰن،4۔الرحیم۔

اس کی مختلف حکمتیں علماء کرام نے لکھی ہیں۔

ا۔کیونکہ گناہ چار حالات کے اندر من حصر ہیں۔سراً،علانیۃً،لیلاً،نہاراً۔یہ چاروں کلمے چاروں اوقات کے گناہوں کے لیے کافی ہیں۔

۲۔چار کلمات اس لیے ہیں کہ جس مخلوق کو یہ کلام عطا کیا جارہا ہے اس کے زمانے بھی چار ہیں۔

ا۔ربیع،۲۔خریف،۳شتاء،۴۔صیف۔

۳۔اجزاءبدن بھی چار ہیں۔آتش،خاک،باد،آب۔

۴۔بدن کے مزاج بھی چار ہیں۔نماز،زکوٰۃ،حج،صوم

۵۔اصلاح نفس کے لیے احکام بھی چار ہیں۔نماز،ذکوٰۃ،حج،صوم۔

۶۔قوی بدن چار ہیں۔حرارت برودت،رطوبت،یبوست۔

۷۔باطن کے صفات بھی چار ہیں۔عقل،علم،خوف،رجاء۔

۸۔اقوال جو زبان سے ادا ہوتے ہیں ان کی اصلاح بھی چار کلمے ہیں۔سبحان اللہ،الحمد للہ،لا الہ الا اللہ،اللہ اکبر۔

۹۔ملائکہ کے اندر معظم فرشتے بھی چار ہیں۔جبرائیل۔میکائیل۔عزرائیل،اسرافیل۔

۱۰۔افضل الکتب بھی چار ہیں۔تورات،زبور،انجیل،قرآن کریم۔

۱۱۔ افضل الانبیاء بھی چار ہیں ۔ خلیل ،کلیم ،روح اللہ ،حبیب اللہ صلی اللہ علیہم و علیٰ نبینا محمد وسلم۔

۱۲۔خلافت بھی چار کے اندر رہے۔ابو بکر،عمر،عثمان علی رضی اللہ عنہم۔

۱۳۔کلمہ طیبہ میں بھی چار کلمے ہیں۔لا الہ،الا اللہ،محمد،رسول اللہ۔

۱۴۔اکبر سلاطین بھی چار ہیں۔ذوالقرنین،سلیمان،داؤد علیہ السلام،محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

۱۵۔بڑی جنتیں بھی چار ہیں۔طوبیٰ،حسنیٰ،جنت النعیم جنت الفردوس۔

۱۶۔بڑے جہان بھی چار ہیں۔انسان،جنات،ملائکہ،انعام۔

۱۷۔ جہنم کے بڑے طبقات بھی چار ہیں ورک الاسفل،حطمۃ،لظیٰ،سقر۔

۱۸۔اکبر الخلائق بھی چار ہیں۔لوح قلم،عرش،کرسی۔

۱۹۔اس امت کے لیے افضل الزمن بھی چار ہیں ۔خیر القرون۔ثم الذین یلونہم۔ثم الذین یلونہم،عیسیٰ علیہ السلام کا زمانہ بعد از نزول۔

۲۰۔افضل بیوت اللہ بھی چار ہیں۔کعبۃ اللہ،بیت المقدس،بیت المعمور،مسجد النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

۲۱۔افضل النساء بھی چار ہیں ۔آسیہ المرأۃ فرعون،مریم بنت عمران،خدیجہ رضی اللہ عنہا زوجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم،فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا بنت النبی صلی اللہ علیہ وسلم

۲۲۔افضل العلم بھی چار ہیں۔عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ،عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ،حضرت علی رضی اللہ عنہ،حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا۔

”با“ کو لمبا لکھنے میں حکم:

بسم اللہ کے شروع میں الف کو حذف کر کے باء کو لمبا لکھتے ہیں اس کے اندر بھی باء کا لمبا ہونا راز ہے۔

پہلی وجہ:

یہ ہے کہ جب حضرت علی بن عبد العزیز کے دور مبارک میں قرآن کریم لکھا گیا تو انہوں نے کاتب کو حکم دیا تھا کہ الف کو حذف کرو، طول الباء اور باء کو لمبا کر کے لکھو۔ باء کو لمبا اس لیے کرتے ہیں تا کہ اس بات پر دلالت کرے کہ یہاں ہمزہ حذف ہو چکا ہے۔

دوسری وجہ:

باء کے لمبا ہونے کی مفسرین نے یہ بھی لکھی ہے تا کہ قرآن کریم کی ابتداء معظم حروف سے ہو۔

تیسری وجہ:

اس کے بارے میں علماء اہل اشارہ نے فرمایا ہے کہ باء کو لمبا اس لیے کیا گیا کہ اشارہ کرنا مقصود ہے۔ کہ حرف ”ب“ اسم اللہ کے ساتھ متصل ہوئی تو رفعت اور بلندی نصیب ہو گئی۔ اے بندے اگر تو بھی اللہ کا قرب حاصل کرے گا تو تجھے بھی رفعت اور بلندی نصیب ہو گی۔

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو ارشاد فرمایا تھا:

”القی الدواۃ وحرف القلم وانصب الباء وفرق السین ولا تصور المیم“ الخ۔

ترجمہ: یعنی با کو کھڑا رکھو۔ سین کو جدا رکھو۔ میم کو گول رکھو، اللہ کو واضح کرو، رحمٰن کو لمبا کرو، رحیم کو عمدہ رکھو اور قلم کو اپنے کان پر رکھو۔ اس کی وجہ سے بات بہتر اور زیادہ یاد رہتی ہے۔

اس طرح حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے کاتب کو قرآن کریم لکھنے کا حکم دیا۔ تو فرمایا:

"طول الباء واظهر السينات و در الميم"۔

بسم اللہ کو باء سے شروع کیا گیا ہے:

بسم اللہ شریف کو ب سے شروع کیا گیا ہے۔ جب کہ اس سے قبل بھی لفظ الف موجود تھا۔ اس کے بارے میں علماء وجوہ لکھی ہیں:

ا۔ پہلی وجہ:

یہ بھی ممکن ہے باء چونکہ اتصال اور قرب پر دلالت کرتی ہے اور الف الفت پر دلالت کرتا ہے۔

حالانکہ اتصال اور قرب پہلے ہوتا ہے اور الفت بعد میں ہوتی ہے اس لیے حرف باء کو ابتداء میں رکھ دیا گیا ہے۔ جو کہ اشارہ ہے ت اے میرے بندو! پہلے میری عبادت اور ریاضت کے ذریعے قرب اور اتصال تلاش کرو۔ اس کے بعد تمہیں میری الفت اور رضا حاصل ہو گی۔

۲۔ دوسری وجہ:

یہ بھی ممکن ہے کہ انسان کی تخلیق کے بعد انسان نے بھی سب سے پہلے حرف باء کو ادا کیا تھا ۔اس کے صلہ میں اللہ پاک نے بھی حرف باء کو رکھ دیا۔ جیسا کہ قرآن کریم کے اندر موجود ہے کہ جب واقعہ کا عہد انسانوں سے لیا گیا تو انسان نے زبان سے اقرار کیا تھا۔ کہ "قالوا بلیٰ" اس جواب کے

شروع میں پہلا حرف باء ہے۔اس کی یاد دہانی کے طور پر اور تعلق کی بناء پر بسم اللہ کے شروع میں حرف باء استعمال ہوا۔

۳۔ تیسری وجہ:

قرآن کی موجودہ ترتیب کے اندر سب سے پہلے حرف پہلے حرف باء ہے اور قرآن کریم کے آخر میں حرف سین ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے (مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ) آخر میں س ہے۔اس میں اشارہ ہے کہ بس یعنی یہ جو قرآن کریم ہے یہ تمہاری ہدایت کے لیے کافی ہے اور افلاح کے لیے کافی ہے۔

۴۔ چوتھی وجہ:

با ہمیشہ مکسور ہوتی ہے۔اس لیے اس کے اندر انکسار ہے۔جو کہ اللہ کے محبوب ہے، جیسا کہ ایک حدیث قدسی کے اندر ارشاد ہے۔"انا عندہ المنکسرۃ قلوبھم من اجلی" ان کے قریب ہوں جن کے دل میری وجہ سے عاجزی میں ہوں۔

۵۔ پانچویں وجہ:

باء کے اندر تساقط اور تکسر ہے۔لیکن حقیقت کے اندر رفع شان اور علو ہے۔رفع مقام اس لیے کہ اس پر نقطہ ہے۔جب کہ الف پر نقطہ نہیں ہے اور علو اس طرح کہ اس پر ایک ہی نقطہ آتا ہے۔ تاکہ اس کی حالت محبوب کی طرح ہی ہو جائے۔کیونکہ وہ بھی ایک ہے۔ بخلاف الف کے اس کے اندر ایسا نہیں ہے۔

٦۔ چھٹی وجہ:

باء قربت کے حق کے طلب کرنے میں صادق ہے۔کیونکہ جب درجہ پالیا تو اپنے آپ کو محبوب کے حکم کے نیچے رکھا ہے۔جیسا کہ باء کا نقطہ بھی نیچے ہے۔بخلاف میم وغیرہ ان کا لفظ بیچ میں ہے۔

۷۔ساتویں وجہ:

الف حرف علت ہے جو کہ بعض صورتوں میں حذف ہو جاتا ہے۔لیکن باء کسی قانون کی لاء سے حذف نہیں ہوتی ہے۔

۸۔آٹھویں وجہ:

الف بسا اوقات لکھنے میں آنے کے باوجود تکلم اور قرآۃ میں نہیں آتا،جب کہ باء کے اندر ایسا نہیں ہے۔

۹۔نویں وجہ:

باء حرف تام ہے،کیونکہ متبوع فی المعنی ہے،جب کہ الف متبوع نہیں ہے۔بلکہ تابع ہوتا ہے

۔

۱۰۔دسویں وجہ:

الف کا وجود بعض صورتوں میں ختم ہو جاتا ہے۔جیسا کہ امام فراء کے نزدیک الف پر جب کوئی حرکت وغیرہ آجائے تو ہمزہ بن جاتا ہے لیکن باء کی حالت ختم نہیں ہوتی۔

۱۱۔گیارہویں وجہ:

باء حرف عامل ہے اسماء کے اندر عمل کرتا ہے۔اس کے اندر طاقت ہے اور الف حروف عاملہ میں سے نہیں ہے۔

۱۲۔بارہویں وجہ:

صفات نفس کے اندر باء کامل ہے۔اس کے اندر قدرت ہے۔غیر کو توجہ کے اندر کامل کرنے میں جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے،**انا النقطۃ تحت الباء**۔

بسم اللہ شریف کے اندر اس حرف باء کے بارے میں خواجہ صدر الدین رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں:

"الباء حرف الاتصال و التضمین لا بتداء الموجودات باللہ و الحادثات من اللہ و ما من موجود الا بہ منہ"۔

یعنی باء کے اندر اللہ کے ساتھ اتصال کائنات کا معنی پایا جاتا ہے۔

اور یہ حرف اس بات کو متضمن ہے کہ کائنات کے اندر جتنے بھی موجودات ہیں، وہ سب اللہ کی طرف سے اور ع حوادثات بھی اللہ کی طرف سے اور جو کچھ موجود ہے، وہ اللہ کی طرف سے اور ان کی بقاء بھی اس کے ساتھ متعلق ہے۔

بسم اللہ کے مفردات کی تحقیق

الاسم اور سکون حرف اول:

حرف باء کے بعد اسم ہے۔ لغت اردو کے اندر اس حرف کے اسم کا معنی ہے۔"نام" جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد باری ہے۔

فَکُلُوا مِمَّا ذُکِرَ اسۡمُ اللّٰہِ عَلَیۡہِ (سورۃ الانعام: ۱۱۸)

ترجمہ: تو کھاؤ اس میں سے جس پر اللہ کا نام لیا گیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ حرف اسم کا معنی قرآن کریم کے اندر نام ہے۔ یا جیسا کہ عام مشہور ہے۔ ما اسمک؟ تیرا نام کیا ہے؟ عربی کے اندر دس حروف ایسے ہیں جن کے ابتدائی حروف ساکن ہیں ۔جیسا کہ تفسیر کشاف کے اندر ہے:

"الاسم احد الاسماء العشرۃ التی بنوا اوائلھا علی السکون"۔

یعنی اسم ان دس حروف میں سے ہے جن کا حرف اول ساکن ہوتا ہے۔ مثلاً لفظ ابن ان کے ابتدائی حروف ساکن ہونے کی وجہ سے ان کے ابتداء میں ہمزہ کو زائد کر دیتے ہیں۔ اسم بھی ان میں سے ایک ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسم کے شروع میں ہمزہ نفس کلمہ کا نہیں ہے۔ کیونکہ اس اسم کو بغیر ہمزہ کے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ جیسا کہ شاعر کا شعر ہے۔ "**باسم الذی فی کل سورۃ سمہ**" یعنی اس ذات کے نام سے جس کا نام ہر سورت میں موجود ہے۔

قابل غور بات یہ ہے کہ جس طرح یہ اسم کا لفظ ان اسماء میں سے ہے جن کا ابتدائی حرف ساکن ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ ان حروف میں سے بھی ہے جن کا آخری حرف حذف ہوتا ہے۔

جن کو محذوفۃ الاعجاز کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ ید (ہاتھ) یہ اصل میں یدی ہے۔ دم اصل میں دمو ہے۔ اسی طرح اسم یہ اصل میں سمو ہے۔ یہ بھی کلام اللہ کے کمالات میں سے ہے کہ کلام اللہ کے شروع میں ایسا کلمہ ہے جو محذوفۃ الاعجاز میں سے بھی ہے اور ساکن الاوائل میں سے بھی ہے۔

الاسم مایعرف بہ ذات الاصل:

یعنی جس سے کسی چیز کی اصل ذات کا علم ہو۔

بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ اس اسم کے اصل "الاسم" ہے جس کا معنی قوۃ اور غضب ہے ۔اس لیے شیر کو اسامۃ کہتے ہیں۔

ابو عمر بن علاء سے اس کی تفسیر معلوم کی گئی ہے کہ اسم کیا ہے فرمایا اس اسم کے اندر سات لغات ہیں:

۱۔ اسم، ۲۔ اسم، ۳۔ وسم، ۴۔ سمی، سمی۔

یعنی ہمزہ کا ضمہ اور کسرہ کا کسرہ اور ضمہ اور سمی ہدی کے وزن پر۔

پھر اسماء کی دو قسمیں ہیں:

اسماء الخالق، اسماء المخلوقات۔

پھر ہر ایک کی دو قسمیں ہیں:

۱جمل ۲۔ مفصل۔

مخلوق کے وہ اسماء جو مجمل ہیں۔ اس کی کئی صورتیں ہیں۔ یا کسی شخص واحد کے لیے ہو گی یا غیر شخص کے لیے جب شخص کے لیے ہو گی یا تو عاقل کے لیے ہو گی جیسے ملک، بشیر وغیرہ یا غیر عاقل کے لیے ہو گی۔ جیسے فرس یا بقرہ وغیرہ یا پھر نامی ہو گی جیسے نباتات شجر وغیرہ۔

یا جماد ہو گی جیسے حجر اور مدر وغیرہ یا غیر شخص کے لیے ہوں گی پھر حوادث ہوں گی۔

مثلاً: قیام قعود یا اسم زمان ہو گی۔ جیسے یوم لیلۃ وغیرہ یا ان میں سے کسی ایک کا خلف ہو گی پھر مضمر جیسے انا، انت وغیرہ اسم ہو گی جیسے ہذہ یا ذاک وغیرہ یہ وہ تھے جو مجمل طریقے پر ہوں۔

اور مخلوق کے وہ اسماء جو مفصل ہوں۔ ان کی چالیس اقسام ہیں۔

۱۔ خاص، ۲۔ عام، ۳۔ مشتق، ۴۔ موضوع، ۵۔ تام، ۶۔ ناقص، ۷۔ معدول، ۸۔ ممتنع، ۹ ممکن، ۱۰۔ معرب اور مبنی، ۱۱۔ مضمر، ۱۲۔ مظہر، ۱۳۔ مبہم، ۱۴۔ اشارہ، ۱۵۔ لقب، ۱۶۔ علم تعریف، ۱۷۔ منکر، ۱۸۔ جنس، ۱۹۔ معہود، ۲۰۔ مزید، 21 ۔ ملحق، ۲۲۔ مقصور، ۲۳۔ ممدود، ۲۴۔ معتل، ۲۵۔ سالم مذکر ومؤنث، ۲۶۔ مفرد، ۲۷۔ مفہوم، ۲۸۔ مجموع، ۲۹۔ مدغم، ۳۰۔ مدوب ومضاف، ۳۱۔ منادی مکبر، ۳۲۔ مصغر، یہ تو مخلوق کے اسماء تھے۔ اور اللہ کے اسماء کی بھی اقسام ہیں۔

(ا) مجمل پھر اس کی چند صور تیں ہیں۔راجع الی الذات جیسے اللہ۔الالہ۔الرب یاراجع الصفات ہوں گی۔ جیسے عالم۔ قادر۔ سمیع۔بصیر وغیرہ ہماراجع الی الافعال ہوں گی جیسے صانع رازق یاخان یا راجع الی الاقوال ہوں گی جیسے صادق متکلم یااسماء الخالق مفصل ہوں گی۔اس کی چند صور تیں ہیں بعض تووہ ہیں۔جو صرف ذات حق کے ساتھ خاص ہیں۔اللہ کے علاوہ کسی اور پر اس کا اطلاق نہیں ہے۔ جیسے اللہ الا لہ۔الاحد۔الصمد یاکچھ ایسے اسماء ہیں جن کا علم علی التعیین صرف اللہ رب العزت کے ساتھ خاص ہے جسے اسم کہتے ہیں۔اس کی تعیین میں اختلاف ہے جس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں بیان کر آئے ہیں۔اللہ کے کچھ اسماء ایسے ہیں جو اللہ اور مخلوق کے ساتھ مشترک ہیں۔وہ اسماء اللہ کے لیے حقیقتاً علی وجہ الکمال مطلقاً ہیں اور مخلوق کے لیے اضافت کے ساتھ ہی مستعمل ہیں جیسے عبد العزیز عبدالحلیم وغیرہ مجازاً ہیں۔عزیز، علیم، رحیم۔

اللہ کے کچھ اسماء ایسے ہیں جن کا بذاتہ اللہ پر اطلاق جائز ہے۔ مگر ان کی ضد کا اطلاق نہیں ہے جیسے عالم، قادر، ان کی ضد کا اطلاق جائز نہیں ہے۔

مثلاً: جاہل، عاجز یہ جائز نہیں ہے۔کچھ اسماء ایسے ہیں جو ذات حق کے لیے مدح ہیں، مخلوق کے لیے مذمت جیسے جبار، غفار، متکبر، قہار وغیرہ اور کچھ اسماء ایسے ہیں جن کے افعال سے معانی توماخوذ ہیں مگر ان الفاظ کا اطلاق ذات حق پر جائز نہیں ہے۔ جیسے مکار، مثلاً واللہ خیر الماکرین۔قتال جیسے کہ قاتلھم اللہ انی یو فکون۔

کیاد جیسے و اکید کیداً مستھزیٔ اللہ یستھزیٔ بھم ایسے اسماء کی ایک وہ تاویل ہے جو جمہور علماء کرتے ہیں ایک تاویل اس کی ہے۔جو شیخ ابن العربی نے کی ہے۔

کچھ اسماء ایسے ہیں کہ ان کا اطلاق ذات حق پر مطلقاً جائز ہے۔ مثلاً الرحمٰن، الرحمٰن القدوس، المھیمن۔

کچھ اسماء ایسے ہیں جن کا اطلاق توقیفاً جائز ہے۔ مثلاً لطیف، جواد، النور۔ الواسع اور کچھ اسماء ایسے ہیں جو اثبات کے لیے ہیں۔ لیکن ان کا اطلاق اللہ پر جائز نہیں۔ مثلاً موجود وغیرہ ان اللہ کو شی کے نام سے نہیں پکار سکتے۔

الاسم:

لفظ اسم کا اطلاق قرآن کریم میں ٦ معانی کے لیے مستعمل ہے۔

توحید: وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ (سورۃالمزمل:٨) یعنی لا الا الا اللہ۔

بمعنی المسمیٰ: تَبَارَکَ اسْمُ رَبِّکَ (سورۃالرحمن:٧٨)

صفت اور نعمت: وَلِلّٰہِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَی (سورۃالاعراف:١٨٠) یعنی صفاۃ العلیٰ۔

مسمیاۃ العالم: وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا (سورۃالبقرۃ: ٣١) یعنی عرفہ اسماء المسمیاۃ۔

بمعنی اصنام وآلہۃ: إِنْ هِيَ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوهَا (سورۃالنجم:٢٣)

شبہ مثال عدیل: هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا (سورۃمریم:٦٥) ای عدیلاً وبدیلاو نظیرا۔

بسم اللہ کے دلچسپ حیرت انگیز نکات

انسانی زبان پر سب سے پہلے آنے والا حرف باء:

قرآن مجید کا آغاز بسم اللہ سے کیا گیا ہے۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ عالم ارواح میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسانوں سے جب میثاق "الست" لیا تو انسانوں کی زبان پر سب سے پہلے بلیٰ کا لفظ آیا.......

اس کے شروع میں باء تھا اور بسم اللہ کے شروع میں بھی باء ہے۔ تو باء وہ پہلا حرف ہے جس سے انسان کے لب پہلے پہل آشنا ہوئے تو قرآن میں بھی غالباً حکمتِ الٰہی نے چاہا کہ افتتاح قرآن میں بھی اس حرف کی خصوصیت رہے اس لئے بھی لوگ اس عہد "الست" کو یاد رکھیں اور احکام قرآن کی تعمیل اور امتثال میں مشغول رہیں۔ (ھدیۃ)

عاجزی اور فروتنی کا حصول اور حروف باء:

قرآن مجید کا آغاز بسم اللہ سے اور باء کے حروف سے کیا گیا۔ الف سے نہیں کیا گیا۔ اس میں دوسرا نکتہ یہ ہے کہ الف بسبب طوالت کے یعنی لمبا ہونے کے بڑائی رکھتا ہے اور باء میں بنسبت الف کے عاجزی ہے...... تو اشارہ دے دیا کہ بندوں کی عاجزی اللہ کو پسند ہے اور اسی میں ان کی ترقی اور بلندی ہے جیسا کہ حدیث مبارکہ میں آتا ہے۔ و من تواضع للہ رفعہ اللہ۔

وصل باری تعالیٰ کی نعمت کا حصول اور حرفِ باء:

باء سے قرآن کے آغاز میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ باء شفوی حروف میں سے ہے کیونکہ باء کی ادائیگی سے لب مل جاتے ہیں۔۔۔ اس میں نکتہ اور راز ہے کہ جیسے بسم اللہ پڑھنے سے تیرے لب مل رہے ہیں تجھے ب رب بھی مل جائے گا۔ (ھذیہ)

تقرب الٰہی کا حصول اور حرفِ باء:

باء کے حروف سے آغاز میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ باء کے معنی میں اتصال اور معیت ہے اور بندہ کی سب سے بڑی تمنا بھی یہی ہے کہ اسے رب مل جائے۔ اس کا قرب مل جائے۔

نجات کا حصول: قرآن کا آغاز باء کے حرف سے اور اختتام سین کے حرف سے کیا۔ایک نکتہ یہ ہے کہ دونوں ملا کر پڑھیں تو بس سمجھ میں آتا ہے۔(بس بن جاتا ہے) ہدایت کے لیے بس۔یہی نسخہ کیمیا ہے۔یہی راہ نجات ہے۔(ھدیہ)

تواضع اور بلندی کا حول اور حرفِ باء:

حرف باء میں اصل کسرہ ہوتا ہے تو اس کے اندر عاجزی اور مسکنت ہے، تو پرورد گار نے اس کو اپنے کلام کے شروع میں لاکر بلند کر دیا، باء کی پستی اللہ کو پسند آگئی۔(ھدیہ)

ذات الٰہیہ تک رسائی اور حرفِ باء:

بسم اللہ کہا باللہ نہیں کہا۔لفظ اسم لانے میں بھی ایک راز پوشیدہ ہے۔اے قرآن پڑھنے والے ابھی تم آغاز میں ہو تو پہلے نام تک تمہارے رسائی ہو گی پھر ذات تک بھی پہنچ جاؤ گے۔(ھدیہ)

اسم الٰہی کی بلندی کی طرف لطیف اشارہ:

بسم اللہ کہا باللہ نہیں۔ایک نکتہ اس میں یہ ہے کہ جس طرح ذات باری کا مقام بہت بلند ہے اسی طرح اسم باری تعالیٰ کا مقام بھی بہت بلند ہے۔

اسم الٰہی کی برکت کی طرف باریک اشارہ:

ایک نکتہ اس میں یہ بھی پوشیدہ ہے کہ ذات باری سے جس طرح برکت حاصل ہوتی ہے اس میں باری تعالیٰ بھی اسی طرح برکت کے حصول کا ذریعہ ہے۔

اسم الٰہی کی برکت اور کائنات:

ایک نکتہ اس میں یہ بھی ہے کہ بندے کو بتایا جارہا ہے کہ ہمارے نام کی تاثیر بھی معمولی نہیں ہے......بلکہ اس نام کی برکت سے یہ جہان قائم کر رکھا ہے۔

اسم اللہ لانے میں حکمت اور نکتہ:

اللہ تعالیٰ کے نام تو بہت سے ہیں لیکن ذاتی نام ایک ہے۔ باقی نام صفاتی ہیں۔ اس میں ایک لطیف اشارہ ہے کہ ذاتی نام ایک ہے اور صفاتی متعدد ہیں۔(ھدیہ)

ذاتی نام اور صفاتی ناموں میں فرق

ذاتی نام کے مفہوم میں تمام صفاتی نام شامل ہیں جبکہ صفاتی ناموں میں ذاتی نام کی جامعیت شامل نہیں۔

صفاتی ناموں میں سے کوئی حرف نکال دیا تو معنی مفہوم بدل کردہ جاتا ہے۔ جبکہ ذاتی نام کا مفہوم حرفوں کی کمی باوجود باقی رہتا ہے۔ مثلاً:

رحمان میں سے کوئی حرف کم کر دیا جائے تو مفہوم ختم ہو جائے گا۔

رحیم میں سے کوئی حرف کم کر دیا جائے تو مفہوم ختم ہو جائے گا۔

ستار میں سے کوئی حرف کم کر دیا جائے تو مفہوم ختم ہو جائے گا۔

غفار میں سے کوئی حرف کم کر دیا جائے تو مفہوم ختم ہو جائے گا۔

کریم میں سے کوئی حرف کم کر دیا جائے تو مفہوم ختم ہو جائے گا۔

لیکن لفظ اللہ سے اگر الف کو کم کر دیا جائے تو اللہ ہی اللہ بن جاتا ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے۔(لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (سورۃالشوریٰ: ۴۹)) اور اللہ ہی کے لیے ہے۔ زمین آسمان کی بادشاہت۔ اگر ایک لام کم کر دیا جائے تو مفہوم باقی رہے گا.........لہ بن جائے گا۔ قرآن مجید میں

ہے کہ (مُلْکُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (سورۃ الحدید:۲)) اگر ایک لام اور کم کر دیا جائے تو "ہ" بن جائے گا۔ اور "ہ" بھی اللہ کی ذات کو بتلاتا ہے۔ (اللّٰہُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ (سورۃ البقرۃ))۔

رحمان رحیم دو صفتوں کا انتخاب اور تین نکتے

رحمان رحیم لانے کا پہلا نکتہ:

رحمان رحیم دو صفتوں کو لاکر دنیاوی اخروی نعمتوں کی طرف اشارہ کر دیا...... کیونکہ نعمتیں دو قسم کی ہیں، دنیاوی، اخروی۔ تو رحمان کے لفظ میں دنیاوی نعمتوں کی طرف اشارہ کر دیا، رحیم کہہ کر اخروی نعمتوں کی طرف اشارہ کر دیا۔

رحمان رحیم لانے کا دوسرا نکتہ:

نعمتوں کی ایک اور تقسیم ہے: عام نعمتیں، خاص نعمتیں

رحمان سے عام نعمتوں کی طرف اشارہ کر دیا، رحیم سے خاص نعمتوں کی طرف اشارہ کر دیا۔

رحمان رحیم لانے کا تیسرا نکتہ:

نعمتوں کی ایک اور تقسیم ہے، بڑی بڑی نعمتیں، چھوٹی چھوٹی نعمتیں۔ رحمان کا لفظ لاکر اشارہ کر دیا کہ بڑی بھی نعمتیں بھی وہی دیتا ہے۔ اور لفظ رحیم کو ذکر کر دیا۔ چھوٹی چھوٹی تمام نعمتیں بھی وہی عطا کرتا ہے۔ (الماوردی)

ایک ذاتی نام اور دو صفاتی نام لانے میں نکتہ:

بسم اللہ الرحمان الرحیم: ایک ذاتی نام دو صفاتی نام ذکر کیے۔ اس طرح کل تین نام ذکر کیے۔ کیا راز ہے؟

نکتہ:

دنیامیں افراد کی تقسیم تین طرح کی ہے: مفرد، تثنیہ، جمع۔اسی طرح انسان کی عمر کے اعتبار سے انسان تین طرح کے ہوتے ہیں لڑکپن، جوانی، بڑھاپا۔ حیثیت کے اعتبار سے بھی انسان تین طرح کے ہوتے ہیں: امیر غریب، فقیر۔عالم بھی تین طرح کے ہوتے ہیں: عالم دنیا، عالم برزخ، عالم آخرت۔ اوقات کی تقسیم بھی تین طرح کی ہوتی ہے: زندگی، نیند موت، آخرت میں بھی تین ہی حالات ہوں گے۔ دوزخ، اعراف، جنت۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے تین ناموں کو اختیار فرمایا تاکہ تینوں حالات کی طرف اشارہ ہو جائے۔

کل تین ناموں کے انتخاب میں نکتہ:

صفاتی نام تو بہت سے تھے۔ ان تین ناموں کا انتخاب کیوں کیا۔اس میں کیاراز ہے؟

نکتہ:

کسی چیز کو وجود ملتا ہے، پھر اس کو باقی رکھا جاتا ہے، پھر اس کو فنا کر دیا جاتا ہے، تو ہر چیز پر یہ تین دور آتے ہیں اور آئیں گے تو اس مناسبت سے ان تین ناموں کا ذکر کیا۔ کائنات کی ہر چیز کو وجود دیا تو اللہ تعالیٰ نے پھر اس کائنات میں بے شمار مخلوق ظلم کر رہی ہے۔ اس کے باوجود سب کو باقی رکھنے کی وجہ اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانیت ہے۔ پھر فنا کر کے دوبارہ اپنے خاص بندوں پر رحمت خاصہ کرنا یہ صفت رحیم سے تعلق رکھتا ہے۔اس لیے ان تین ناموں کا ذکر کیا۔(تفسیر ابو سعید حنفی)

صفت رحمان صفت رحیم سے پہلے کیوں لائے؟

پھر صفت رحمان کو صفت رحیم پر مقدم ذکر کرنے میں کیاراز ہے؟

نکتہ:

اللہ کا اسم سب سے پہلے بسم اللہ میں آیا ہے۔ یہ ایسا لفظ ہے جو باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے ۔یعنی اللہ کے علاوہ کوئی بھی شخص نہ مفرد کی صورت میں اس سے موصوف ہو سکتا ہے نہ مصاف کی صورت میں۔ اس لیے اللہ کا لفظ سب سے پہلے لائے۔ اس کے بعد الرحیم ایسا لفظ ہے جس کے ساتھ کوئی بھی موصوف ہو سکتا ہے ۔ مفرد کی صورت میں بھی ،مضاف کی صورت میں بھی ۔ اس کے درمیان میں لفظ الرحمان آتا ہے جو غیر اللہ کے ساتھ مضاف ہو کر تو موصوف ہو سکتا ہے۔ لیکن مفرد کی صورت میں باری تعالیٰ کے علاوہ کوئی اور موصوف نہیں ہو سکتا۔ تو اللہ اور رحمان اور رحیم کی ترتیب قائم ہو گی۔

بسم اللہ الرحمان الرحیم،انیس حروف اور تین نکتے:

بسم اللہ میں انیس حروف ہیں اس میں کیا راز ہے؟

پہلا نکتہ:

دن رات کی ساعات چوبیس ہیں۔ ان میں پانچ ساعات میں پانچ نمازیں ہیں۔ باقی انیس ساعات بچتی ہیں تو بسم اللہ کے حروف ۱۹ رکھے اشارہ ہے جو باقی اوقات میں بسم اللہ کا اہتمام کرے گا اس کی باقی ساعات بھی محفوظ رہیں گی۔

دوسرا نکتہ:

ہر ہر ساعت کا شکریہ واجب ہے۔۔۔ پانچ ساعات کا شکریہ نمازوں کے ساتھ باقی ساعات کا شکریہ بسم اللہ کے ساتھ ادا کیا جا سکتا ہے۔

تیسرا نکتہ:

قرآن مجید میں آتا ہے کہ جہنم میں عذاب کے افسر فرشتے ۱۹ ہوں گے۔(جو زندگی میں بسم اللہ کا اہتمار رکھے گا تمام قسم کے عذابوں سے محفوظ رہے گا۔)(تفسیر مظہر العجائب)۔

بسم اللہ، الرحمن، الرحیم، کا باہمی ربط اور تعلق (دو نکتے):

پہلا نکتہ:

لفظ اللہ لا کر اشارہ دے دیا انسان کسی چیز کا خالق نہیں ہے۔ پھر لفظ الرحمان لا کر اشارہ دے دیا کہ انسان اس کی بقا کا تحمل بھی نہیں کر سکتا۔۔۔ کہ اس کو باقی رکھ سکے۔

پھر الرحیم صفت لا کر اشارہ دے دیا کہ انسان بذاتِ خود اس سے نفع بھی نہیں اٹھا سکتا وہ رحیم ذات یہی ہے جو انسان کو انتفاع کے قابل بناتی ہے۔

دوسرا نکتہ:

کسی کے خوف سے اس کی بات مانی جاتی ہے یا کسی کی محبت کی بنا پر اس کی بات مانی جاتی ہے۔ تو بسم اللہ میں پہلے اللہ کا نام ذکر کیا جس کے نام سے پہاڑ تھر تھراتے اور کانپتے ہیں۔ پھر الرحمن الرحیم کا ذکر کیا جس کے احسانات عام خاص سب پر ہیں۔ ج تو گویا دونوں طرح سے خدا ہی ایسی شان والا ہے کہ اس کی بات مانی جائے۔

بسم اللہ کی تفسیری تشریحات

تسمیہ کی تفسیر میں حرف باء کے معنی و مفہوم اور افادیت استعمال کے بعد دوسرا قابل توجہ پہلو یہ ہے کہ ان الفاظ کو ذاتِ باری کے ذکر سے نہیں بلکہ اسم باری کے ذکر سے شروع کیا گیا ہے ۔اگر اللّٰہِ الرَّحْمَنِ الرَّحِیمِ کے الفاظ استعمال ہوتے تو ان کا معنی یہ ہوتا ہے کہ اللہ سے (مدد طلب

کرتے ہوئے شروع کرتاہوں) جو رحمان ورحیم ہے۔ لیکن یہاں الفاظ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمَنِ الرَّحِیۡمِ کے استعمال ہوئے ہیں۔ جن کا معنی یہ ہے کہ ”اللہ کے نام سے (مدد طلب کرتے ہوئے شروع کرتا ہوں) جو رحمان ورحیم ہے۔“

الفاظی قرآنی سے صاف ظاہر ہے کہ اس جگہ براہ راست باری تعالیٰ سے استعانت کی بجائے اسم باری تعالیٰ سے استعانت کی تلقین کی گئی ہے۔ جس کی وجہ سے یہ جاننے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اسم کا معنی کیا ہے؟

اس کا اپنے مسمی یعنی ذات وصفات باری سے کیا تعلق ہے؟ اور اس کی اپنی کیا اہمیت و خصوصیت ہے جس کی بنا ہے جس کی بنا پر ہر فعل مشروع کا آغاز اسی کے ذکر سے کرنے کا حکم ہے؟ کیونکہ یہ نکتہ اپنی جگہ نہایت اہم ہے کہ ذات وصفات باری کے ذکر پر لفظ اسم کو کیوں مقدم کیا گیا۔

لفظ اسم کا معنی:

لفظ ”اسم“ نام کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کی تعریف عام طور پر یوں کی گئی ہے۔

الاسم مایعرف بہ ذات الشیء

اسم وہ لفظ یا علامت ہے جس سے کوئی چیز پہچانی جائے۔

اس کے لغوی اشتقاق کے بارے میں علماء کے دو اقوال ہیں۔ ایک یہ کہ اسم سمایسمو سے مشتق ہے اور دوسرے وسم یسم سے۔

سمو:

یہ لفظ اسم کا پہلا مادہ اشتقاق ہے جس کا معنی بلندی ہے۔ اسی سے السموہے جو بلند ہونے پر ظاہر ہونے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ آسمان کو بھی اس کی بلندی کے باعث سماء کہتے ہیں۔ نام کو محض اس لئے اسم کہتے ہیں کہ اس کے ذریعے کسی شخص کا ذکر کیا جاتا ہے اور اس کی ذات کو ظہور

ملتاہے۔اگر کسی کا نام نہ لیا جائے تو وہ شخصیت مخفی رہتی ہے۔اس کے ظاہر ہونے کا معنی یہ ہے کہ وہ گمنامی اور اخفاء کی کیفیت سے نکل کر ذکر اور ظہور کی بلندی تک پہنچ جائے۔کیونکہ نامعلوم کا معلوم ہو جانا یقینا ظہور اور بلندی ہی کی ایک صورت ہے۔امام راغب اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

سمو و سمو وھو الذی به رفع ذکر المسمی فیعرف به۔

سمو اور سمو ۔اس سے مراد وہ نام ہے جس کے ذریعے مسمی کا ذکر بلند اور نمایاں ہوتا ہے اور وہ پہچانا جاتا ہے۔

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر مفسرین لفظ اسم کا معنی بیان کرے ہوئے لکھتے ہیں۔

فَاسْمُ الشَّيْءِ مَا عَلَاهُ حَتَّى ظَهَرَ ذَلِکَ الشَّيْءُ بِهِ۔[1]

ترجمہ: پس کسی چیز کا اسم وہ (نام) ہے جو اس چیز کو بلند کرے۔یہاں تک وہ چیز ظاہر ہو جائے۔

اسم کے اشتقاق کے سلسلے میں یہ نقطۂ نظر علمائ بصرہ کا تھا۔

وسم........علماء کوفہ کے نزدیک اسم کا مادہ اشتقاق وسم ہے۔

وسم، یسم، سمة ..... کا معنی علامت اور پہچان ہے۔ جب کہ امام راغب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

الوسم التأثیر و السمة الأثر [2]

وسم تاثیر کو اور سمہ اثر کو کہتے ہیں۔

قرآن میں وسم بمعنی علامت کی تائید یوں ملتا ہے۔

سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ (سورۃ الفتح: ۲۹)۔

ترجمہ: ان کی علامت اُن کے چہروں میں ہے سجدوں کے نشان سے۔

---

[1] مفاتیح الغیب=التفسیر الکبیر ج ۱ ص ۱۰۵

[2] المفردات في غريب القرآن الباب کتاب الخاء ج ۱ ص ۵۲۴

قرآن میں مزید فرمایا گیا:

تَعۡرِفُهُمۡ بِسِيمَاهُمۡ (سورۃالبقرۃ:۲۷۳)

ترجمہ: تو انہیں ان کی صورت سے پہچان لے گا۔

علامت اور تاثیر کے دونوں معنوں میں تطبیق یہ ہے کہ کسی چیز کی تاثیر ہی دراصل اس چیز کی صحیح پہچان اور علامت ہوا کرتی ہے۔ اس لئے یہ دونوں معنی ایک ہی مدعا کو پورا کررہے ہیں۔ مذکورہ بالا بحث کی روشنی میں یہ بالکل واضح ہوچکا ہے کہ لفظ اسم کا پہلا معنی بھی کسی چیز کے ظاہر ہونے پر دلالت کرتا ہے اور دوسرا بھی۔ گویا اسم وہ لفظ ہے جو کسی ذات کو یا اس کی تاثیر کو ظاہر کررہا ہو۔ تاثیر بالاتفاق ذات کی صفت ہوا کرتی ہے۔ چناچہ خلاصہ کلام یہ ہوا کہ "کسی ذات یا اس کی صفت کو ظاہر کرنے والا لفظ اسم کہلاتا ہے" گویا یہ امر تحقیق کے ساتھ طے پاگیا کہ اسم ایک لفظ ہے جو کسی ذات کو یا اس کی صفات کو ظاہر اور نمایاں کرتا ہے۔ اگر اسم کسی ذات کی نشاندہی کرے تو اسم اسم ذات کہتے ہیں اور اگر صفات کی نشاندہی کرے تو اسم صفات، ذات اور صفاتی نام کا امتیاز اسی تقسیم پر مبنی ہے۔ لفظ "اسم" کا الف گرا کر اس کی جگہ "ب" ملادیا گیا اور اس طرح باسم کی بجائے بسم معرض وجود میں آگیا۔

ابو بکر وراق رحمۃ اللہ علیہ کی منفرد اور اچھوتی تحقیق:

حضرت ابو بکر وراق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بسم اللہ کی باء میں اللہ تعالیٰ کے چھ صفاتی ناموں کی طرف اشارہ ہے:

۱۔ **باری**: یعنی عرش سے فرش تک ہر چیز کا بنانے والا۔

۲۔ **بصیر**: عرش سے فرش تک سب مخلوقات کو دیکھنے والا۔

۳۔**باسط**: عرش سے فرش تک کی مخلوقات کے لیے فراخی کرنے والا۔

۴۔**باقی**: عرش سے فرش تک سب کو فنا کر دینے والا اور خود باقی رہنے والا۔

۵۔**باعث**: عرش سے فرش تک مخلوقات کو فنا کر دینے کے بعد اٹھانے والا۔

۶۔**بر**: عرش سے فرش تک کی مخلوقات پر احسانات کرنے والا۔

(غنیۃ الطالبین)

بسم اللہ کی سین سے اللہ تعالیٰ کے پانچ صفاتی ناموں کی طرف اشارہ ہے:

۱۔**سمیع**: عرش سے فرش تک سب مخلوقات کی پکاروں کو سننے والا۔

۲۔**سید**: عرش سے فرش تک سب مخلوقات کا سردار۔

۳۔**سریع الحساب**: عرش سے فرش تک سب مخلوقات کا محاسبہ کرنے والا۔

۴۔**سلام**: عرش سے فرش تک سب مخلوقات کو سلامتی بخشنے والا۔

۵۔**ساتر**: عرش سے فرش تک سب مخلوقات کے گناہوں پر پردہ ڈالنے والا۔

(غنیۃ الطالبین)

بسم اللہ کی میم میں اللہ تعالیٰ کے بارہ صفاتی ناموں کی طرف اشارہ ہے:

۱۔**ملک الخلق**: مخلوق کا بادشاہ۔

۲۔**مالک الخلق**: مخلوق کا بادشاہ۔

۳۔**منان علی الخلق**: مخلوق پر احسان کرنے والا۔

۴۔**مجید**: بزرگی والا مخلوق میں۔

۵۔**مؤمن**: مخلوق کو امن دینے والا۔

۶۔**مھیمن**: مخلوق کی نگہبانی کرنے والا۔

۷۔**مقتدر**: مخلوق کی نگرانی کرنے والا۔

۸۔**مقیت**: مخلوق کی نگرانی کرنے والا۔

۹۔**مکرم**: مخلوق کو عزت و تکریم دینے والا۔

۱۰۔**منعم**: مخلوق پر نعمتیں کرنے والا۔

۱۱۔**مفضل**: مخلوق پر مہربانی کرنے والا۔

۱۲۔**مصور**: مخلوق کی صورتیں بنانے والا۔

(غنیۃ الطالبین)

بسم اللہ کے دلچسپ رموز واشارات

حروف بسم اللہ:

اس اسم مبارک کے جس طرح کلمات سے سب علماء نے بحث کی ہے۔ اسی طرح اس کے حروف کے اندر بھی علماء نے دقائق بیان کیے ہیں، بلکہ قرآن مجید کے تمام حروف کے اندر دقائق اور اشارات پوشیدہ ہیں۔

جعفر بن محمد سے مروی ہے آپ نے ارشاد فرمایا کہ قرآن کریم کے اندر چار اشیاء ہیں۔

۱۔عبارۃ، ۲۔لطائف، ۳۔اشارات، حقائق۔

عبارۃ عوام کے لیے اور لطائف اولیاء کرام کے لیے اور اشارات خواص کے لیے اور حقائق انبیاء کرام علیہم السلام کے لیے ہوتے ہیں۔

اس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد مبارک ہے۔ قرآن کریم کی قرأت کے اندر چار معانی ہیں۔

۱۔ظاہر، ۲۔باطن، ۳۔حد، ۴مطلع۔

ظاہر سے مراد تلاوت ہے۔باطن سے مراد فہم ہے اور حد سے مراد حلال وحرام کے احکام ہیں۔مطلع سے مراد اللہ ذوالجلال کی مراد خاص ہے اور بعض علماء کرام نے ارشاد فرمایا ہے کہ قرآن مجید عبارۃ، اشارات، حقائق اور لطائف کا نام ہے عبارت سننے کے لیے، اشارات عقل کے لیے، لطائف مشاہدہ کے لیے اور حقائق استلام کے لیے۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ قرآن کے لیے چار چیزیں ہیں:

۱۔ظاہر، ۲۔باطن، ۳۔حق، حقیقت۔

امام جعفر صادق نے ارشاد فرمایا کہ قرآن نو وجوہ پر ہے۔

۱۔حق، ۲۔ حقیقت، ۳۔ تحقق، ۴۔ حقائق، ۵۔ عقود، ۶۔ عہود، ۷۔ حدود، ۸۔ قطع الحقائق۔

۹، واجلال المعبود۔

امام جعفر صادق سے یہ بھی مروی ہے کہ قرآن سات انواع پر ہے۔

۱۔تعریف، ۲۔تکلیف، ۳۔تعطیف، ۴۔ تشریف، ۵۔ تالیف، ۶۔ تخویف، ۷۔تکنیف۔

پھر اس کے بعد قرآن کے اندر امر، نہی، وعد، رخص، تاسیس تمحیص ہیں۔

پھر اس کے بعد قرآن داعی شاہد، حافظ، شافی ہے۔واقع ہے۔نافع ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ قرآن کریم کے حروف کے اندر دقائق واشارات ہیں۔اس طرح بسم اللہ کے اندر بھی دقائق اور اشارات مخفی ہیں۔

(ا) چنانچہ بسم کے اندر پہلا حرف باء ہے جس کے اندر کشف البقاءلاھل الغناء کاراز مضمر ہے۔

(۲)دوسرا حرف سین ہے۔اس کے اندر کشف ثناءالقدوس لاھل الانس کاراز مضمر ہے۔

(۳)تیسرا حرف میم ہے جس کے اندر کاراز حجۃ اللہ تعالیٰ مخصوص الخصوص مضمر ہے۔

بعض علماء نے اس طرح فرمایا کہ باء کے اندر بدوالعبودیت ہے اورالسین کے اندر سر الربوبیہ ہے اور میم کے اندر من اللہ علی اھل الصفوۃ۔

علی بن موسیٰ الرضا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا،الباءبقاءاللہ اورسین رسالت والی اورمیم ملک و لایت والی ہے۔

اور بعض علماء نے فرمایاہے کہ حضرت ابو سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایاکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے جب آپ علیہ السلام کوکسی معلم کے پاس تعلیم کے لئے بھیجاتو معلم نے ان کو کہاکہ لکھ۔ آپ علیہ السلام نے فرمایاکہ کیالکھوں، معلم نے کہا''بسم اللہ''لکھ۔ آپ علیہ السلام نے فرمایاکہ کیا آپ ''بسم اللہ''کو جانتے ہو۔ اس نے کہاکہ نہیں، فرمایاکہ الباء بہاءاللہ اور سین سناءاللہ اور میم ملک اللہ ہے۔البتہ ابن کثیر نے اس روایت کو ضعیف قراردیاہے۔

حرف باء

تفسیر بحر العلوم میں لکھاہے کہ شیخ ابو بکر وراق نے فرمایاکہ ''بسم اللہ''جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے۔اس کے ہر حرف کی تفسیر ہے۔باءاس پہلا حرف ہے۔ جس کے اندر چھ وجوہ ہیں۔

(۱)اس کا مفہوم الباءباریٔ الخلق من العرش الی الثریٰ۔

چنانچہ قرآن کے اندرارشادہے۔هُوَ اللهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ۔(الحشر ۲۴)

(۲)الباءبصیر لخلقه من العرش الی الثریٰ۔یعنی عرش سے تحت الثریٰ تک نظر ہے۔

جیساکہ ارشادہے۔إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ بَصِيرٌ (الملک ۱۹)

(۳)الباءباسط الرزق ہے جیساکہ ارشادباری تعالیٰ ہے۔ قُلْ إِنَّ رَبِّي يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ۔(سبا ۳٦)

(۴)الباءباقی ہےجب کہ مخلوق عرش سے ثریٰ تک فناہو جائے گی جیساکہ ارشادہے۔ وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّکَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ(الرحمن ۲۷)

(۵)الباءباعث الخلق بعدالموت من العرش الی الثریٰ ہے جیساکہ ارشادہے۔وَأَنَّ اللَّهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُورِ۔(الحج۷)

(٦)الباءبارالمؤمنین من العرش الی الثریٰ ہے جیساکہ ارشادہے۔ إِنَّهُ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيمُ (الطور۲۸)

حرف السین

"بسم اللہ" کے اندر دوسرا حرف سین ہے اس کے اندر بھی پانچ وجوہ ہیں:

(۱)سین سمیع الاصوات من العرش الی الثریٰ ہے جیساکہ ارشادہے۔إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (الشعراء۲۲۰) فرمانِ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا،الحمدللہ الذی وسع سمعه الاصوات۔ تمام تعریفیں اس ذات کے لئے ہیں جس کی صفت سمع کائنات کی ہر چیز کی آواز پر غالب ہے۔

نیز تبارک الذی اوعی سمعه کل شئی۔ برکت اسی ذات کی ہے جس کی صفت سمع ہر چیز کو محیط ہے۔ فرمانِ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ هذه امراءة سمع الله شکواهامن فوق سبع

سموات۔ یعنی یہ وہ عورت ہے جس کا شکوہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات عالیہ نے سات آسمانوں کے اوپر سے سنا تھا۔

(۲)سین سید الخلق ہے۔من العرش الی الثریٰ۔جیسا کہ ارشاد ہے۔اللّٰہُ الصَّمَدُ (الاخلاص ۲)۔

(۳)سین سریع الحساب ہے۔جیسا کہ ارشاد ہے۔وَ اللّٰہُ سَرِیعُ الْحِسَابِ (البقرۃ۲۰۲)۔

(۴)سین سلام الخلق من الظلم۔ من العرش الی الثریٰ ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔السلام المومن۔

(۵)سین ساتر الذنوب ہے۔جیسا کہ ارشاد ہے۔ستار العیوب۔غَافِرِ الذَّنْبِ (غافر ۳)

حرف المیم:

تیسرا حرف المیم ہے۔اس کے اندر بارہ وجوہ ہیں:

۱۔میم مالک الخلق ہے جیسا کہ ارشاد ہے۔الْمَلِکُ الْقُدُّوسُ (سورۃالحشر ۲۳)

۲۔ میم ملک الخلق ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔اللّٰھُمَّ مَالِکَ الْمُلْکِ (آلعمران ۲٦)

۳۔ میم منان ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔ذُو الْعَرْشِ الْمَجِیدُیالقدمن اللہ۔

۴۔ میم مومن ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔وَ آمَنَھُمْ مِنْ خَوْف۔(سورۃقریش:۴)

۵۔ میم مہیمن ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔الْمُھَیْمِنُ الْعَزِیزُ۔(سورۃالحشر:۲۳)

٦۔ میم مقتدر ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔عِنْدَ مَلِیکٍ مُقْتَدِرٍ (سورۃالقر:۵۵)

۷۔ میم حقیقت ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔وَ کَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَيْءٍ مُحِیطًا سورۃالنساء:۱۲٦

۸۔ میم مکرم ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔وَ لَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (سورۃبنی اسرائیل:۷۰)

۹۔ میم منعم مبلغ جیسا کہ ارشاد ہے۔اسبغ علیکم نعمہ ظاھرۃ و باطنۃ۔

۱۰۔ میم فضل ہے جیسا کہ ارشاد ہے۔ إِنَّ اللّٰہَ لَذُو فَضْلٍ عَلَی النَّاسِ (سورۃالبقرۃ:۲۴۳)

کل عالم اور اسم الہٰ:

ہر عالم کے اندر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا کوئی نہ کوئی اسم مبارک ہے۔ مثلاً صامتون۔ رب الخلق کہتے ہیں۔ سموات میں رب الملک ہے۔ بحر میں رب النبات ہے۔ خشکی میں رب الروح ہے۔ پہاڑوں میں رب البریات ہے۔ بہائم میں الخالق ہے۔ نبات کے اندر رب الخضروات ہے۔ استجار کے اندر رب المتمرہے وحوش کے اندر رب الفضاءہے۔ ساتویں زمین کے اندر رب کریم ہے۔ مشرق کے اندر حی کریم ہے۔ مغرب کے اندر سبوح قدوس ہے۔ لیل کے اندر المحی ہے۔ نہار کے اندر الممیت ہے ۔ صحف شیث علیہ السلام کے اندر ذو العرش المجید ہے۔ صحف ادریس علیہ السلام کے اندر فعال لما یرید ہے۔ صحف ابراہیم کے اندر ولی الرحمہ ہے۔ تورات کے اندر رحمٰن ہے۔ انجیل کے اندر رحیم ہے۔ مومنین کے پاس قرآن مجید میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہے۔

تین حروف:

بسم کے اندر تین حروف ہیں۔ بابرأت عن الخلق ہے۔ سین سرور بالخلق ہے۔ اور المیم ملازمۃ علی باب الخالق یابلاء العارفین فی الدنیا ہے۔ السین سرور العارفین فی العقبیٰ اور المیم مرتبۃ العارفین عندالمولیٰ ہے۔

یااس طرح کہ:

بسم الباءمبرۃ للارواح الانبیاءبالھام الرسالۃ والسین لیسرہ مع اھل المعرفۃ بالالھام والشریعۃ والمیم منۃ المؤبدین بددام النظر الیھم

یااس طرح کہ:

بسم الباءنبوۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سین سر النبوۃ الذی اسری النبی المیم بمکۃ الدین الذی یعم الاسود والابیض۔

یا اس طرح کہ:

بسم الباءبرہ لعمم السین سرہ للخصوص و المیم محبة لخصوص المخصوص۔

خزینۃ الاسرار کے اندر یہ بات موجود ہے کہ جنتی لوگ ہفتہ کے دن پانی والی نہر سے پانی پئیں گے اور اتوار کو شہد کی نہر سے پانی پئیں گے۔ سوموار کے اندر دودھ والی نہر سے اور منگل کے دن شراب کی نہر سے یہ تمام اقسام کی روحانی نعمتوں سے مستفید ہوں گے۔ تو معرفت خداوندی کے نشہ سے مست ہو جائیں گے۔ وجد میں آکر اڑنا شروع کر دیں گے۔ ہزار سال کے بعد کستوری کے بنے ہوئے ایک پہاڑ پر جا پہنچیں گے۔ وہاں نہر سبیل بہتی ہے بدھ کے روز وہاں سے پانی پی کر پھر اڑیں گے ایک ہزار سال اڑنے کے بعد ایک سبز محل میں جائیں گے جس کے باری میں قرآن میں ارشاد ربانی ہے۔

فِيهَا سُرُرٌ مَرْفُوعَةٌ (۱۳) وَأَكْوَابٌ مَوْضُوعَةٌ (۱۴) وَنَمَارِقُ مَصْفُوفَةٌ (۱۵) وَزَرَابِيُّ مَبْثُوثَةٌ۔ (الغاشیۃ ۱۶)

اس مقام پر پہنچ کر اپنے تختوں پر بیٹھ جائیں گے۔ اب ان کو ایسی شراب پلائی جائے گی۔ جس کی صفت قرآن کریم نے بیان فرمائی ہے۔

كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيلًا (الانسان ۱۷) بیان فرمائی ہے۔ یہ جمعہ کا دن ہو گا۔ اس کے بعد ایک ہزار سال اڑیں گے۔ اس کے بعد اس مقام پر پہنچے گا۔ جس کو قرآن نے بیان فرمایا ہے۔ فِي مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيكٍ مُقْتَدِرٍ (القمر ۵۵) بیان کیا ہے۔ یہاں ان کو درجہ خلود کے دستر خوان پر بٹھا کر يُسْقَوْنَ مِنْ رَحِيقٍ مَخْتُومٍ (المطففین ۲۵) بوتلیں پلائی جائیں گی۔ یہ احسانات اور انعامات ان انسانوں کے لئے ہیں جو اعوذ باللہ پڑھ کر ہر قسم کی مصیبت سے باز رہے اور بسم اللہ پڑھ کر اعمال صالحہ بجالائے۔

خلاصہ ٔکلام یہ ہوا کہ ماطابت الدنیاالابسمہ وماطابت العقبی الا بعفوہ وماطابت الجنۃالا برؤیتہ۔

یعنی دنیاکی زندگی ان کے نام سے ہی مبارک ہے۔آخرت کامزہ اس کے معاف کرنے سے ہی میسر ہے اور جنت اس کے دیدار سے مرکب ہے تو مزہ ہے۔

کسی عارف کے بارے میں منقول ہے کہ جب ان کی موت کاوقت آیاانہوں نے اپنے اقرباء کو کہاکہ جب میں مر جاؤں توبسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھ کر میرے کفن میں رکھ دیں۔اہل خانہ نے اس کی وجہ دریافت کی ۔انہوں نے فرمایاکہ میں نے سناہے کہ ایک امیر کبیر کے دروازے پر ایک سائل آیا۔اہل خانہ نے اسے معمولی سی بخشش دے کر رخصت کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اوزار لے کر آیااوردروازے کو اکھاڑنے لگا۔ اہل خانہ نے پوچھایہ کیاکرتے ہو۔ کہنے لگایاتو بخشش اس دروازے کے موافق کر دویادروازہ اس بخشش کے مطابق کر دو۔چنانچہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بھی کلام اللہ کادروازہ ہے۔قبر کے اندر جب حساب کتاب وجزاءسزاکا عمل شروع ہو گاتومیں بھی فرشتوں سے درخواست کروں گامعاملہ باب بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے موافق کریں۔

الرحمٰن الرحیم

الرحمٰن کے بارے میں علماءکااختلاف ہے کہ یہ کس سے مشتق ہے۔بعض علماءنے فرمایا ہے کہ اس کے لئے کوئی اشتقاق نہیں ہے۔ یہ صرف اللہ ذوالجلال کے مختصہ ناموں میں سے ہے کیونکہ اگر یہ اسم رحمت سے مشتق ہوتا۔جیساکہ بعض اہل علم کاخیال ہے توچاہیئے تھاکہ جب اہل عرب نے اس کوسناتواس کاانکارنہ کرتے کیونکہ وہ رحمت کے منکر نہیں تھے حالانکہ قرآن کریم سے یہ بات ثابت ہے کہ انہوں نے اس اسم کو پہچاننے سے انکار کر دیاتھا،جیساکہ ارشادرب العزت ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اسْجُدُوا لِلرَّحْمَنِ قَالُوا وَمَا الرَّحْمَنُ (الفرقان ۶۰)

اس طرح جب حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر معاہدہ کو تحریر کیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم کے حکم سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو لکھا تھا۔ سہیل بن عمرو نے کہا کہ ہم نہیں جانتے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کیا ہے۔ آپ باسمک اللھم لکھیں۔

لیکن جمہور علماء کا خیال ہے کہ یہ اسم رحمت سے مشتق ہے اور مبنی بر مبالغہ ہے اور اس کا معنی ہے کہ ایسی رحمت والا جس کی کوئی نظیر نہیں ہے۔ اس لئے اس کی نہ جمع ہوتی ہے اور نہ تثنیہ بخلاف رحیم کے۔ امام ابن حصار رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس اسم کے مشتق ہونے میں دلیل وہ حدیث بھی ہے جس کو ترمذی نے روایت فرمایا اور اس کی تصحیح فرمائی ہے۔

عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ

قال اللہ انا الرحمٰن خلقت الرحم و شققت لھا اسما من اسمی۔

یعنی میں رحمت ہوں اور میں نے ہی رحم کو پیدا کیا ہے اور اس کو اپنے نام سے مشتق کیا ہے جو اس کو ملائے گا میں اس کو ملاؤں گا جو اس کو قطع کرے گا میں اس کو قطع کرے گا میں اس کو قطع کروں گا۔

اس روایت سے یہ بات واضح ہو گئی یہ اسم مبارک مشتق ہے رحم سے۔ رہا اہل عرب کا انکار وہ ان کی اپنی جہالت اور شقاوت تھی۔

الرحمٰن

مبرد اور الانباری کا خیال ہے کہ رحم عربی لفظ نہیں ہے بلکہ عبرانی ہے۔ اس لیے اس کے ساتھ عربی لفظ رحیم لایا گیا ہے۔ نیز یہی قول ابو اسحاق الزجاج کا معانی القرآن میں ہے، وہ کہتے ہیں کہ احمد بن یحییٰ نے فرمایا کہ الرحیم عربی اور الرحمٰن عبرانی ہے یعنی رحیم عربی ہے اور الرحمٰن عبرانی

ہے۔ان کا فرمان ہے کہ الرحمٰن اسم عربی نہیں ہے بلکہ عبرانی ہے۔یہ قول مرجوح ہے اورراجح قول یہ ہے کہ یہ لفظ عربی ہے۔

فرق رحمٰن اور رحیم میں

(۱) رحمٰن ، رحیم دونوں اللہ ذوالجلال کے صفاتی نام ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ

هما اسمان رقيقان احدهما ارق من الآخر۔

یعنی رحمٰن،رحیم اللہ تعالیٰ کے نام ہیں۔ان دونوں کے اندررحمت ایک دوسرے سے بڑھ کر پائی جاتی ہے۔

(۲) حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مروی ہے کہ انہوں نے ارشاد فرمایا کہ الرحمٰن کا تعلق دنیا اور آخرت دونوں سے ہے اوررحیم کا تعلق صرف آخرت سے ہے۔

ابوعلی فارسی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ رحمٰن عام ہے۔ ہر قسم کی رحمت کے اندر جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اوررحیم صرف مومنین کے اعتبار سے ہے جیسا کہ ارشاد ہے۔

وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا (الاحزاب ۴۳)

(۳) نیز عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ تعالیٰ سے مروی ہے کہ الرحمٰن۔

اذا سئل اعطى اور الرحيم اذا لم يسأل يغضب۔

یعنی رحمٰن وہ ہے کہ جب اس سے مانگا جائے وہ عطا کردے اوررحیم وہ ہے جب کوئی نہ مانگے ناراض ہو۔

اس قسم کی ایک اورروایت ترمذی اورابن ماجہ کے اندر بھی نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم سے منقول ہے۔

من لم یسأل اللہ یغضب علیہ۔

(۴) ابن جریر سے مروی ہے کہ الرحمٰن تمام خلق کے لئے یعنی کافر اور مومن کے لئے اور رحیم صرف اہل ایمان کے لئے ہے۔ جیسا کہ آیت کریمہ میں ہے۔

ثُمَّ اسْتَوَی عَلَی الْعَرْشِ الرَّحْمَنُ۔ (الفرقان ۵۹)

ایک اور مقام پر ارشاد ہے۔

الرَّحْمَنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوَی (طٰہٰ ۵)

استویٰ کے ساتھ رحمٰن کو ذکر کیا تاکہ اس کی رحمت تمام خلق کو شامل ہو اور اہل ایمان کے لئے تخصیص کے طور پر یہ ارشاد فرمایا:

وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا (الاحزاب ۴۳)

(۵) نیز ایک فرق رحمٰن اور رحیم کے اندر یہ بھی ہے کہ رحمٰن کا اسم صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔ جیسا کہ ارشاد رب العزت ہے۔

قُلِ ادْعُوا اللَّهَ أَوِ ادْعُوا الرَّحْمَنَ أَيًّا مَا تَدْعُوا فَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى (الاسراء ۱۱۰)

دوسرے مقام پر ارشاد رب العزت ہے۔

الرَّحْمَنُ فَاسْأَلْ بِهِ خَبِيرًا (الفرقان ۵۹)

نیز الرَّحْمَنُ (۱) عَلَّمَ الْقُرْآنَ (الرحمن ۲)

أَجَعَلْنَا مِنْ دُونِ الرَّحْمَنِ آلِهَةً۔ (الزخرف ۴۵)

غور کیجئے کہ جب مسیلمہ کذاب نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اس نے اپنا لقب رحمٰن رکھ لیا اور اپنے آپ کو رحمٰن الیمامہ کا لقب دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر کذب کا لقب ولباس ڈال دیا اور اس کا لقب بجائے رحمٰن کے مسیلمہ کا لقب ہو گیا۔

لیکن رحیم کا اطلاق مخلوق پر بھی ہوتا ہے۔ جیسا کہ اعظم المخلوقات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کی شان میں وارد ہے کہ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ (التوبة ۱۲۸)

(۶) بعض علماء نے یہ فرق بھی بیان فرمایا ہے کہ رحمٰن کا تعلق بڑی اور جلیل نعمتوں کے ساتھ ہے اور رحیم کا تعلق مخفی اور دقیق نعمتوں کے ساتھ ہے۔

برکاتِ بسم اللہ

(۷) حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک روایت منسوب ہے کہ بسم اللہ ہر بیماری کے وقت شفاء ہے اور ہر دوا کی افادیت کے لئے مدد گار ہے۔

(۸) الرحمٰن ہر انسان کے لئے معاون ہے اور الرحیم صرف لِمَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدَى (طه ۸۲) کے لئے ہے۔

نکاتِ بسم اللہ

حضرت کعب احبار رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک تفصیلی روایت ہے کہ بسم اللہ کے اندر جتنے حروف ہیں سب کسی اسم مبارک کی طرف مشیر ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

باء اسم بصیر کی اشارہ ہے۔ س، اسم سمیع کی طرف، م اسم مَلیک کی طرف۔ اللہ، الف اللہ کی طرف، لام لطیف کی طرف، ہاء ہادی کی طرف۔

الرحمٰن، راء رازق کی طرف، حاء حلیم کی طرف، نون کی طرف۔

(۹) بعض علماء نے رحمٰن اور رحیم کے اندر اس طرح بھی فرق فرمایا ہے کہ رحمٰن کا مقام یہ ہے کہ رحم غضب پر غالب ہے۔

جیسا کہ ارشاد ہے۔رَحۡمَتِي وَسِعَتۡ كُلَّ شَيۡءٍ(الاعراف ۱۵۶)رحیم کا مقام یہ ہے کہ اس کے سخط اور غضب پر کرم کا پردہ ہے۔

(۱۰) رحمٰن اسم قدیم ہے۔رحیم اسم البقاء ہے۔رحمٰن اسم الحقیقۃ ہے۔رحیم اسم الصفۃ ہے۔

(۱۱) بعض علماء نے فرمایا کہ رحمٰن اسم بھی خاص ہے۔ فعل بھی خاص ہے اور رحیم فعل بھی عام ہے اور اسم بھی عام ہے۔

(۱۲) بعض علماء نے فرمایا کہ رحمٰن بالنعمۃ ہے اور رحیم بالعصمۃ ہے۔

(۱۳) بعض علماء نے فرمایا کہ رحمٰن بالتجلی ہے اور رحیم بالتدلی ہے۔

(۱۴) بعض علماء نے فرمایا کہ رحمٰن بکشف الانوار ہے اور رحیم بحفظ ودائع الاسرار ہے۔

(۱۵) بعض علماء نے فرمایا کہ رحمٰن بذاتہ ہے اور رحیم بالنعوت والصفات ہے۔

(۱۶) حضرت واسطی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ رحمٰن شوقِ روح ہے اور رحیم ذوقِ حق ہے۔

(۱۷) حضرت ابراہیم خواص رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس کو یہ علم ہو گیا کہ وہ رحمٰن رحیم ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کی معرفت لازم ہو گی، اس معرفت کی بنا پر دنیا میں اس کے لئے عافیت ہے۔ رزق ہے۔یہ رحمٰن ہوا اور آخرت میں مغفرت رحمٰن غفران ہے۔یہ رحیم ہوا۔

(۱۸) حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ رحمت کی دو قسمیں ہیں۔ رحمت لطف، رحمت عطف۔ رحمٰن کے اندر رحمتِ لطف ہے اور رحیم کے اندر بھی رحمتِ عطف ہے۔

(۱۹) نیز رحمٰن بما روح اور رحیم بما لوح ہے۔

(۲۰) نیز رحمٰن کشف تجلّی کے لئے اور رحیم لطف تولی کے لئے ہے۔

(۲۱) رحمٰن اکرام من الرضوان کے ساتھ ہے اور رحیم من بہ الرضوان کے لئے ہے۔

(۲۲) رحمٰن توفیق کے لئے رحیم محقق کے لئے ہے۔ توفیق معاملات کے لئے ہوتی ہے۔ تحقیق مواصلات کے لئے ہوتی ہے۔

(۲۳) رحمٰن موضوع لہم کے لئے رحیم مدفوع عنہم کے لئے ہے۔

(۲۴) رحمٰن انوار عنایات کے طلوع ہونے کا محل ہے۔ رحیم شمس کفایت کے چمکنے کا محل ہے۔

(۲۵) رحمٰن ہے اہل اللہ کی تائید کرنے کے لئے۔ رحیم ہے ان کی ترقی کے لئے۔

(۲۶) الرحمٰن کے اسم مبارک کے ساتھ معرفت مشتاق ہوتے ہیں اورالرحیم کے ذریعے متحیر ہوتے ہیں۔

(۲۷) بعض علماء نے فرمایا کہ رحمٰن یعنی جس ذات نے دنیامیں اپنے بندوں کو اعمالِ صالحہ کی توفیق دی اورآخرت میں جزادے گا اوراعمال سے زیادہ دے گا۔ جیسے لِلَّذِينَ أَحۡسَنُوا الۡحُسۡنَى وَزِيَادَةٌ۔(یونس ۲۶)

(۲۸) اوررحیم اس طرح کہ آخرت میں اپنے بندوں پر رحم فرمائے گا جمال علی کا نظارہ کرواکر۔

(۲۹) یحیٰی بن معاذرحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ رحمٰن معاش کے اعتبار سے ہے اوررحیم معاد کے اعتبار سے ہے۔

(۳۰) حارث بن اسدرحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ رحمٰن نقوش کے لئے اوررحیم قلوب کے لئے۔

(۳۱) ابو بکروراق رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ رحمٰن بالنعماء ہے اوررحیم بالاآلاء ہے۔

(۳۲) حکیم ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ رحمٰن ہے جہنم سے بچا کر اوررحیم ہے جنت میں داخلہ عطا فرماکر۔

(۳۳) سدی بن مفلس رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ رحمٰن ہے غموں کو دور کرکے اوررحیم ہے گناہوں کو معاف کرکے۔

(۳۴) عبداللہ بن جراح رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ رحمٰن ہے عصمت کا راستہ واضح کرکے رحیم ہے توفیق دے کر۔

(۳۵) خارجہ بن مصعب رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ رحمٰن ہے ہر مخلوق کے لئے۔ رحیم ہے صرف اولیاء کے لئے۔

(۳۶) امام ضحاک رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ رحمٰن ہے اہل ایمان کے لئے کہ ان کو عرش کے قریب رکھا۔ وحی کا امین بنایا۔ شہوات سے پاک پیدا فرمایا بس نور عطا فرمایا۔

(۳۷) رحم ہے اہل ارض کے لئے ان میں رسول بنائے کتب کو نازل فرمایا: ہشام بن عبداللہ عبرانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ رحمٰن ہے اہل عبادت کے لئے کہ ان کی عبادت اگرچہ صافی نہیں لیکن پھر بھی قبول فرماتا ہے رحیم ہے اہل معاصی کے لئے کہ جب توبہ کریں تو سیآت کو حسنات میں تبدیل کردیتا ہے جیسا کہ ارشاد فرماتا ہے۔ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ (الفرقان ۷۰)

(۳۸) بعض علماء نے فرمایا کہ رحمٰن ہے ناشکر کے لئے اور رحیم ہے شکر گزاروں کے لئے۔

معانی الرحمٰن الرحیم

یہ دونوں اسم مبارک مشتق ہیں۔ رحمت سے ان کا اصل مادہ ر، ح، م ح، م ہے۔ قرآن حکیم میں اس کا مادہ تقریباً ۱۴ معانی کے لئے مستعمل ہے۔ تمام معانی کو علی التفصیل بیان کرنا مناسب ہے۔

ا۔ رحمت بمعنی الاسلام ہے جیسا کہ قرآن حکیم میں ارشاد ہے۔ يُدْخِلُ مَنْ يَشَاءُ فِي رَحْمَتِهِ (سورۃ الشوریٰ: ۸)

اس آیت کریمہ میں رحمت سے مراد اسلام ہے اور ظاہر ہے اسلام سے بڑی کیا رحمت ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ امام وکیع کا واقعہ مشہور ہے۔ امام یزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ نے جب امام وکیع کا تذکرہ عام سنا تو شوق ملاقات پیدا ہوا۔ چنانچہ شیخ امام وکیع کی خدمت میں پہنچے۔ لیکن کچھ کہے بغیر الٹے قدم

واپس ہونے لگے۔ امام وکیع نے دریافت فرمایا کہ شیخ آئے تھے۔ لیکن خاموشی سے واپس جارہے ہیں ۔کیاوجہ ہے؟ شیخ نے فرمایا کہ جناب آپ کے تقویٰ اور زہد وعبادت کا چرچاسنا تھا اس لیے زیارت کے لیے حاضر ہوئے تھے۔ لیکن آپ تو صحت مند ہیں۔ جیسے آپ کو کوئی فکر نہیں ہے۔ تقویٰ اور زہد بغیر فکر کے کیسے ممکن ہے۔اس پر امام وکیع نے اس کو بٹھایا اور یہ بات ارشاد فرمائی کہ میری ایسی بہتر صحت دراصل اللہ کی ایک نعمت کی وجہ سے ہے۔اس نعمت اور رحمت کی وجہ سے مجھے ہر وقت خوشی حاصل رہتی ہے۔ اصل ،الفاظ امام وکیع رحمۃ اللہ علیہ کی زبان مبارک سے یہ ہیں۔**وذلک بفرحی بالاسلام۔**

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ رحمت بمعنی الاسلام قرآن حکیم کے اندر مستعمل ہے۔ نیز ارشاد مبارک ہے:

وَلَوْ شَاءَاللّٰہُ لَجَعَلَهُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَكِنْ يُدْخِلُ مَنْ يَشَاءُ فِي رَحْمَتِهِ(سورۃالشوریٰ۸)

اس آیت کریمہ میں بھی رحمت بمعنی اسلام اور دین ہے۔

نیز **لِيُدْخِلَ اللَّهُ فِي رَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ(سورۃالفتح:۲۵)**

۲۔ قرآن حکیم کے اندر رحمت بمعنی جنت بھی مستعمل ہے۔جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:

وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ(سورۃآلعمران:۱۰۷)

نیز ارشاد ہے:**فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِي رَحْمَتِهِ(سورۃالجاثیۃ:۳۰)**۔یہاں بھی رحمت سے مراد جنت ہے۔

نیز**فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَاعْتَصَمُوا بِهِ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِي رَحْمَةٍ مِنْهُ وَفَضْلٍ(سورۃالنساء:۱۷۵)**۔

اس مقام پر بھی رحمت سے مراد جنت ہے۔

۳۔ قرآن حکیم کے اندر رحمت بمعنی مطر (بارش) بھی مستعمل ہے۔جیسا کہ وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ (سورۃالاعراف:۵۷)

یہاں بھی رحمت بمعنی بارش مستعمل ہے۔

۴۔ قرآن حکیم کے اندر رحمت بمعنی نبوت بھی مستعمل ہے۔جیسا کہ ارشاد ہے۔

أَمْ عِنْدَهُمْ خَزَائِنُ رَحْمَةِ رَبِّکَ الْعَزِيزِ الْوَهَّابِ (سورۃص:۰۹)

اس آیت کریمہ کے اندر رحمت بمعنی نبوت ہے۔ نیز ارشاد ہے، ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّکَ عَبْدَهُ زَكَرِيَّا (سورۃمریم:۰۲)۔

نیز آتَيْنَاهُ رَحْمَةً مِنْ عِنْدِنَا (سورۃالکھف:۶۵) یہاں بھی رحمت سے مراد نعمت ہے۔

۵۔ قرآن حکیم کے اندر رحمت بمعنی قرآن بھی مستعمل ہے۔چنانچہ ارشاد ہے۔وھذا ورحمة۔یہاں رحمت سے مراد قرآن ہے۔

نیز قُلْ بِفَضْلِ اللهِ وَبِرَحْمَتِهِ (سورۃیونس:۵۸) یہاں بھی رحمت سے مراد قرآن حکیم ہے۔

نیز وَهُدًى وَرَحْمَةٌ (سورۃیونس:۵۸) یہاں بھی رحمت سے مراد قرآن ہے۔

۶۔ قرآن حکیم کے اندر رحمت بمعنی رزق بھی مستعمل ہے۔جیسا کہ ارشاد ہے۔

قُلْ لَوْ أَنْتُمْ تَمْلِكُونَ خَزَائِنَ رَحْمَةِ رَبِّي (سورۃبنی اسرائیل:۱۰۰) اس آیت میں رحمت سے مراد رزق ہے۔

نیز ارشاد ہے، مَا يَفْتَحِ اللهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَحْمَةٍ (سورۃفاطر:۰۲) اس آیت میں بھی رحم سے مراد رزق ہے۔

نیز ارشاد ہے۔ آتِنَامِنْ لَدُنْکَ رَحْمَةً(سورۃالکھف:۱۰) اس آیت میں بھی رحمت سے مراد رزق ہے۔

۷۔ قرآن حکیم کے اندر رحمت بمعنی نصرت اور فتح بھی مستعمل ہے۔جیسا کہ ارشاد ہے۔
قُلْ مَنْ ذَا الَّذِي يَعْصِمُكُمْ مِنَ اللَّهِ إِنْ أَرَادَ بِكُمْ سُوءًا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً(سورۃالاحزاب:۱۷)۔

اس آیت میں رحمت سے مراد نصرت اور فتح ہے۔

۸۔ قرآن حکیم کے اندر رحمت بمعنی عافیت مستعمل ہے۔جیسا کہ ارشاد ہے۔
إِنْ أَرَادَنِيَ اللَّهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كَاشِفَاتُ ضُرِّهِ أَوْ أَرَادَنِي بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكَاتُ رَحْمَتِهِ(سورۃالزمر:۳۸)۔

اس آیت میں لفظ رحمت دو دفعہ وارد ہوا ہے دونوں سے مراد عافیت ہے۔

۹۔ رحمت بمعنی ایمان بھی قرآن حکیم کے اندر مستعمل ہے جیسا کہ ارشاد ہے۔

وَآتَانِي رَحْمَةً مِنْ عِنْدِهِ(سورۃھود:۲۸) نیز۔وَآتَانِي مِنْهُ رَحْمَةً(سورۃھود:۶۳)۔

دونوں جگہ رحمت سے مراد ایمان ہے۔

۱۰۔ قرآن حکیم کے اندر رحمت بمعنی مودۃ اور محبت بھی مستعمل ہے۔جیسا کہ ارشاد ہے،
وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ رَأْفَةً وَرَحْمَةً(سورۃالحدید:۲۷)

نیز ارشاد ہے کہ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ(سورۃالفتح:۲۹) یہاں رحمت سے مراد متوادین اور محبت مراد ہے۔

۱۱۔ قرآن حکیم کے اندر رحمت بمعنی توفیق بھی مستعمل ہے۔جیسا کہ ارشاد ہے۔فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ(سورۃالبقرۃ:۶۴) یہاں رحمت سے مراد توفیق خداوندی ہے۔

۱۲۔ قرآن حکیم کے اندر رحمت کا لفظ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے بھی ذکر کیا گیا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔ وَلِنَجْعَلَهُ آيَةً لِلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِنَّا (سورۃ مریم: ۲۱)۔

یہاں رحمت سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔

۱۳۔ قرآن حکیم کے اندر لفظ رحمت سید الرسل، امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی مستعمل ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِلْعَالَمِينَ (سورۃ الانبیاء: ۱۰۷)۔

اس آیت کریمہ میں رحمت سے مراد سید الرسل صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم ہیں۔

وصلی اللہ علی صاحبہ الحیاء وصلی اللہ علی من کان احی من الوجودین فی دار الفناء والبقاء محمد محمود حامد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم۔

اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم:

متعدد احادیث میں اسم اعظم کا ذکر آیا ہے اور اسم اعظم کیا ہے؟ اس کے بارے میں بھی متعدد روایات پائی جاتی ہیں۔ اسم اعظم کے بارے میں حضور انور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم نے فرمایا کہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ شانہ پورا فرمادیتے ہیں۔ مصنف نے یہاں چند روایات ذکر کی ہیں۔ جن میں اسم اعظم کا ذکر ہے۔

لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ (سورۃ الانبیاء: ۸۷)۔

ترجمہ: کوئی معبود نہیں سوا تیرے پاکی ہے تجھ کو بے شک مجھ سے بے جا ہوا۔

یہ وہی الفاظ ہیں جن کے ذریعے حضرت یونس علیہ السلام نے اللہ کو پکارااور اس نے ان کی دعا قبول فرما کر اندھیریوں سے نجات دی۔ مصنف رحمتہ اللہ علیہ نے مستدرک حاکم سے یہ روایت نقل کی ہے۔

مستدرک میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو بھی کوئی مسلمان جب کبھی کسی بارے میں ان الفاظ کے ذریعہ دعا کرے گا تو اللہ تعالیٰ ضرور قبول فرمائے گا۔ قال الحاکم حدیث صحیح الاسناد واقرہ الذہبی،اور حاکم نے دوسری روایت اس طرح نقل کی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم نے فرمایا،کیا میں تم کو اللہ کا اسم اعظم نہ بتادوں جس کے ذریعے دعا کی جاتی ہے تو اللہ قبول فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے سوال کیا جاتا ہے تو وہ پورا فرماتا ہے۔ یہ وہ دعا ہے جس کے ذریعہ یونس علیہ السلام نے اللہ کو تین تاریکیوں میں پکارا۔

فَنَادَى فِي الظُّلُمَاتِ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ وَنَجَّيْنَاهُ مِنَ الْغَمِّ وَكَذَلِكَ نُنْجِي الْمُؤْمِنِينَ (سورۃ الانبیاء:۸۸،۸۷)۔

ترجمہ: کوئی تو اندھیریوں میں پکارا کوئی معبود نہیں سوا تیرے پاکی ہے تجھ کو بے شک مجھ سے بے جا ہوا تو ہم نے اس کی پکار سُن لی اور اُسے غم سے نجات بخشی اور ایسی ہی نجات دیں گے مسلمانوں کو۔

۲۔ اللهم إني أسألك أني أشهد أنك لا إله إلا أنت الأحد الصمد الذي لم يلد ولم يولد ولم يكن له كفوا أحد۔[3]

[3] إتحاف الخيرة المهرة بزوائد المسانيد العشرة كتاب الادب ج ٦ ص ٧ ٤ ٤

ترجمہ: الٰہی! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں۔ اس کا واسطہ دے کر کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ تو ہی اللہ ہے تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو اکیلا ہے بے نیاز ہے جس سے نہ کوئی پیدا ہوا اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا اور نہ ہی کوئی اس کے برابر کا (ہمسر) ہے۔

مصنف رحمتہ اللہ علیہ کی ترتیب کے مطابق یہ روایت نمبر ۲ ہے۔ اس میں بھی اسم اعظم بتایا ہے اس کو مصنف رحمتہ اللہ علیہ نے بحوالہ سنن اربعہ اور صحیح ابن حبان اور مستدرک حاکم نقل کیا ہے۔ اس کی روایہ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہما ہیں۔ وہ فرماتی ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم نے فرمایا، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اس نے اللہ کے اسم اعظم کے واسطہ سے دعا کی ہے جس کے واسطہ سے دعا کی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے۔ اور اس کے ذریعہ سے سوال کیا جاتا ہے تو وہ عنایت فرما دیتا ہے۔

حافظ ابن حجر فتح الباری میں فرماتے ہیں کہ جن روایات میں اسم اعظم کا ذکر ہے۔ سند کے اعتبار سے ان میں سب سے زیادہ راجح وہ روایت ہے جو حضرت بریدہ سے مروی ہے اور ابو داؤد، ابن ماجہ، ابن حبان اور حاکم نے اس کی تخریج کی ہے۔ اس روایت کے بعض طرق میں لفظ أني أشهد اور لفظ لا إله إلا أنت نہیں ہے جس کو مصنف نے متصلاً ہی نقل کیا۔ ہم بھی اس کو ذیل میں مع ترجمہ لکھ رہے ہیں۔

ترجمہ: الٰہی مین تجھ سے سوال کرتا ہوں اس لیے کہ تو ہی اللہ ہے اکیلا ہے بے نیاز ہے جس سے نہ کوئی پیدا ہوا اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا اور نہ کوئی اس کے برابر (ہمسر) ہے۔

مصنف رحمتہ اللہ علیہ نے ان الفاظ کے لیے ابن ابی شیبہ کا حوالہ دیا ہے۔

الٰہی ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اس لیے کہ تو ہی اللہ ہے اکیلا ہے بے نیاز ہے جس سے نہ کوئی پیدا ہوا اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا اور نہ کوئی اس کے برابر (ہمسر) ہے۔

مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ کے لیے ابن ابی شیبہ کا حوالہ دیا ہے۔

اللھم إنی أسألک بأن لک الحمد لا إلہ إلا أنت وحدک لا شریک لک المنان بدیع السموات والأرض ذو الجلال والإکرام یا حی یا قیوم۔[4]

اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اس واسطہ سے کہ تیرے ہی لیے سب تعریف ہے۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو اکیلا ہے۔ تیرا کوئی شریک نہیں ہے۔ (تو) بہت بڑا مہربان ہے۔ بہت زیادہ احسان کرنے والا ہے۔ آسمانوں اور زمین کا تو ہی (بے مثال) ایجاد کرنے والا ہے۔ اے (عظمت وجلال اور اکرام والے اے زندہ اے)(سب کو) قائم رکھنے والے)۔

مصنف رحمۃ اللہ علیہ کی ترتیب کے مطابق یہ روایت نمبر ۳ ہے۔ اس میں بھی اسم اعظم بتایا ہے۔ مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے بحوالہ سنن اربعہ، صحیح ابن حبان، مستدرک حاکم، مسند احمد، مصنف ابن ابی شیبہ اس کو نقل کیا ہے۔ مصنف نے اشارہ دیا ہے کہ لفظ یا حی یا قیوم اس کے بعض طرق میں نہیں ہے۔ یہ روایت حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ میں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص نماز پڑھ رہا تھا۔ اس شخص نے بعد نماز یہ الفاظ ادا کیے۔

---

[4] جامع الأحادیث ج ۷ ا ص ۴۲۳

یہ سن کر آنحضرت سرور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس نے اللہ سے اس کو بڑے نام کے ذریعہ دعا کی ہے کہ جب اس کے ذریعہ اس سے سوال کیا جاتا ہے تو عطا فرمادیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ان دو آیتوں میں ہے:

۴۔وَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَٰنُ الرَّحِيمُ (سورۃ البقرۃ: ۱۶۳)۔

ترجمہ: اور تمہارا معبود ایک معبود ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں مگر وہی بڑی رحمت والا۔

الم اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ (سورۃ البقرۃ: ۲۵۵)

ترجمہ: الف۔لام۔میم۔ اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ آپ زندہ اور اوروں کا قائم رکھنے والا۔

مصنف رحمۃ اللہ علیہ کی ترتیب کے مطابق یہ روایت نمبر ۴ ہے۔ اس میں بھی اسم اعظم بتایا ہے۔ اس کو مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے بحوالہ ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور مصلف ابن ابی شیبہ نقل کیا ہے۔ اس کی روایت کرنے والی حضرت اسماء بنت یزید ہیں۔ وہ فرماتی ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم نے فرمایا کہ اللہ کا اسم اعظم ان دونوں آیتوں میں ہے (یہ دونوں آیتیں اوپر لکھی ہیں پہلی آیت سورۃ بقرہ کے رکوع ۱۹ کی آخری آیت ہے اور دوسری آیت سورہ آل عمران کے بلکل شروع میں ہے)۔

۵۔ ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ اللہ کا اسم اعظم ان تینوں سورتوں میں ہے ۔ ا۔سورۃ بقرۃ۔ ۲۔ سورۃ آل عمران۔ ۳۔ سورۃ طٰہٰ۔

قاسم بن عبدالرحمن (جو راوی حدیث ہیں) نے فرمایا کہ میں نے اس حدیث کے تحت اسم اعظم تلاش کیا تو الحی القیوم کو اسم اعظم پایا۔[5](ا)

---

5 (ا) مصنف رحمۃ اللہ تعالیٰ نے یہ روایت بحوالہ مستدرک حاکم نقل کی ہے جو حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا اور حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم کا ارشاد ہے کہ بے شک اللہ کا اسم اعظم ضرور تین سورتیں ہیں:

اول سورۃ بقرہ، دوم سورۃ آل عمران، سوم سورۃ طٰہٰ۔

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کے شاگرد قاسم بن عبدالرحمن فرماتے ہیں کہ میں نے تلاش کیا تو معلوم ہوا کہ تینوں سورتوں میں جو مشترک چیز ہے۔ وہ الحی القیوم ہے۔ اس سے میں سمجھ گیا کہ اسی کو اعظم بتایا ہے۔ سورۃ بقرہ کے اندر آیت الکرسی میں الم اللّٰہ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ ہے اور سورۃ آل عمران میں الم اللّٰہ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ ہے اور سورۃ طہ میں وَعَنَتِ الْوُجوهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّومِ (سورۃ طٰہٰ: ۱۱۱) ہے۔ ان میں الحی القیوم مشترک ہے لیکن دعا کرنے والے کو پورے جملے پڑھنے چاہئیں۔

مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے جو یہ فرمایا کہ میرے نزدیک اللّٰہ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ اسم اعظم ہے، اور اس سے دونوں حدیثوں میں تطبیق ہو جاتی ہے۔ ان کا یہ فرمانا محل نظر ہے کیونکہ دوسری حدیث سورہ طٰہٰ کا بھی ذکر ہے اور سورہ طٰہٰ میں لفظ الحی القیوم سے پہلے اللّٰہ لَا إِلَهَ إِلَّا ہو نہیں ہے۔ ہاں اگر صرف الحی القیوم مراد لیا جائے جیسا کہ قاسم بن عبدالرحمن نے فرمایا تو یہ درست ہے کیونکہ یہ تینوں سورتوں میں مشترک ہے لیکن جمع بین الحدیثین اس صورت میں بھی نہیں ہوتا اور در حقیقت بین الحدیثین کی ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ جن روایات میں جو اسم اعظم بتایا ہے اس کے مطابق عمل کرنا درست ہے ان میں سے جس کو بھی پڑھ کر دعا کرے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ اللہ جل شانہ، دعا قبول فرمالے گا۔ احادیث میں کوئی حصر کا کلمہ نہیں ہے تاکہ صرف کسی ایک کو اسم اعظم مانا جا سکے۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ ابو جعفر طبری اور ابو الحسن اشعری اور ابو حاتم، ابن حبان اور قاضی ابو بکر باقلانی وغیرہم نے فرمایا ہے کہ جن روایات میں لفظ اسم اعظم وارد ہوا ہے ان میں "اعظم" اسم تفضیل کے معنی میں نہیں ہے بلکہ اعظم بمعنی عظیم ہے کیونکہ کسی نام کو اسم اعظم کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی دوسرا نام اس سے اعظم نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے سب نام اعظم ہیں اور یہ معنی لینے سے اعظم بمعنی عظیم ہو جاتا ہے۔

ان حضرات کا یہ بھی فرمانا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعض اسماء کے تفصیل اسماء پر درست نہیں ہے اور جن روایات میں لفظ "اعظم" وارد ہوا ہو وہ اس اعتبار سے ہے کہ اس اسم کے ذریعہ دعا کرنے والے کو ثواب بہت زیادہ ملے گا۔

اس کے بعد حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اسم اعظم کے بارے میں چودہ اقوال نقل کیے ہیں۔ ان میں سے بعض تو ایسے ہیں کہ ان کو اسم اعظم کہنے کے بارے میں کوئی حدیث مروی نہیں ہے۔ کشف یا خواب یا ذاتی رائے سے ان کو اسم اعظم کہہ دیا گیا ہے۔ اور

بعض کے بارے میں روایات موجود ہیں جن میں سے بعض سند کے اعتبار سے صحیح اور بعض ضعیف ہیں اور بعض حسن ہیں اور بعض کے بارے میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان سے اسم اعظم کی تعین پر استدلال کرنے میں نظر ہے۔

اسم اعظم کے سلسلہ میں علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کا مستقل رسالہ ہے جس میں انہوں نے "اسم اعظم" کے بارے میں چالیس اقوال جمع کیے ہیں۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے۔ وَلِلّٰهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ فَادْعُوهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي أَسْمَائِهِ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (سورۃ الاعراف:۱۸۰)

ترجمہ: اور اللہ ہی کے ہیں بہت اچھے نام تو اسے ان سے پکارو اور انہیں چھوڑ دو جو اس کے ناموں میں حق سے نکلتے ہیں وہ جلد اپنا کیا پائیں گے۔

اور سورۃ بنی اسرائیل میں ارشاد ہے:

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ أَوِ ادْعُوا الرَّحْمَٰنَ أَيًّا مَا تَدْعُوا فَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ (سورۃ بنی اسرائیل:۱۱۰)

ترجمہ: تم فرماؤ اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر جو کہہ کر پکارو سب اسی کے اچھے نام ہیں۔

سورۃ حشر کے آخر میں اللہ جل شانہ نے اپنے چند اسماء ذکر فرما کر ارشاد فرمایا ہے:

هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ يُسَبِّحُ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (سورۃ الحشر:۲۴)

ترجمہ: وہی ہے اللہ بنانے والا پیدا کرنے والا (ف۴۷) ہر ایک کو صورت دینے والا اسی کے ہیں سب اچھے نام اس کی پاکی بولتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور وہی عزّت و حکمت والا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کو یاد کرنے اور ان کے وسیلہ سے دعا کرنے کی احادیث شریف میں ترغیب دی گئی ہے۔

اس کے بارے میں بعض روایات میں من احصاھا وارد ہوا ہے اور بعض روایات لایحفظہا احد الا الخ آیا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان دونوں کے ایک ہی معنیٰ ہیں جو شخص اسمائے حسنیٰ کو خوب اچھی طرح ایک ایک کر کے یاد کر لے گا جنت میں داخل ہو گا۔ حدیث کی شرح لکھنے والوں نے من احصاھا کا مطلب اس کے علاوہ بھی بتایا ہے۔

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے جامع صغیر میں بحوالہ حلیہ الاولیاء حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے:

إن لله عز وجل تسعة وتسعين اسما، مائة غير واحدة، إنه وتر يحب الوتر، وما من عبد يدعو بها إلا وجبت له الجنة. الجامع الصغير۔ (الجامع الصغير في أحاديث البشير النذير تأليف الامام جلال الدين عبد الرحمن بن أبي بكر السيوطي ۸۴۹ - ۹۱۱ھ ج ۱ ص ۳۶۱)

اس حدیث کا مضمون وہی ہے جو صحیح بخاری کی روایت میں گزر چکا۔ البتہ اس میں یوں زیادہ ہے کہ جو شخص ان اسماء کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے دعا کرے اس کے لیے جنت واجب ہو گی۔

حصن حصین کے مصنف امام جازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک اللہ لا الہ الا ھو الحی القیوم اسم اعظم ہے تاکہ دونوں حدیثیں موافق ہو جائیں اور اس لیے بھی کہ واحدی کتاب الدعا میں یونس بن عبد الاعلیٰ سے اسی طرح مروی ہے۔ واللہ اعلم یہ قاسم عبد الرحمن کے بیٹے شام کے رہنے والے ہیں۔ تابعی ہیں۔ حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شاگرد ہیں۔ سچے راوی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے اسماء حُسنیٰ:[6]

علامہ حنفی کا حاشیہ جو جامع صغیر پر ہے۔ اس میں یدعو بہا پر لکھا ہے کہ:

ای بعد تلاوتہا او قبل ذلک بان یقول اللھم انی اسالک او اتوسل الیک باسمائک الحسنیٰ کذا و کذا۔

یعنی ان اسماء کو پڑھنے کے بعد دعا کرے یا پہلے دعا مانگ لے۔ پھر یوں عرض کرے کہ اے اللہ! میں آپ سے سوال کرتا ہوں اور آپ کے اسماء حسنیٰ کے ذریعہ آپ کی جناب میں وسیلہ پکڑتا ہوں وہ اسماء حسنیٰ یہ ہیں۔ ان کے بعد ھو اللہ الذی سے آخر تک ننانوی اسماء حسنیٰ پڑھ سے جو معہ ترجمہ نے لکھ دیئے ہیں۔

[6] یہ ننانوی نام جو مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں درج کیے ہیں۔ ان کے حوالے کے لیے سنن ترمذی، سنن ابن ماجہ اور مستدرک حاکم اور ابن حبان کا رمز لکھا ہے لیکن روایت ترمذی سے لی ہے جو ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ مصنف رحمۃ اللہ تعالیٰ سنن ابن ماجہ کا حوالہ نہ دیتے تو اچھا تھا۔ کیونکہ اس میں جو روات ہے اس میں آدھے کے قریب دوسرے اسماء حسنیٰ مذکور ہیں جو ترمذی کی روایت میں نہیں اور بہت سے وہ اسماء نہیں ہیں جو سنن ترمذی میں موجود ہیں حالانکہ سیاق کلام سے یہی متبادر ہوتا ہے کہ سنن ابن ماجہ میں بھی پوری روایت سنن ترمذی کی روات کے مطابق یا اس کے قریب ہو گی۔

مصنف رحمۃ اللہ علیہ سنن ابن ماجہ کی روایت کو مستقل ذکر کر دیتے تو اچھا تھا۔ چونکہ ترمذی کی روایت مذکورہ کے علاوہ دوسرے اسماء حسنیٰ بھی دیگر کتب میں وارد ہوئے ہیں۔ اس لیے محدثین کرام نے فرمایا ہے کہ اس حدیث کا مقصود یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ صرف ننانوے میں منحصر ہیں بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ اسم وہ ہیں جن کا یاد کرنا جنت میں داخل ہونے کا ذریعہ ہے۔

فَالْمُرَادُ الاخبار عَنْ دُخُولِ الْجنَّۃِ باحصائھا لَا الاخبار بحصر الْأَسْمَاءِ۔ (شرح سنن ابن ماجہ ج ۱ ص ۲۷۵)

لیکن اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ سنن ابن ماجہ کی روایت میں بھی یہی ہے کہ جو شخص ان اسماء حسنیٰ کو یاد کر لے گا جنت میں داخل ہو گا۔

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ دونوں روایتیں ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی سے بھی ننانوے نام یاد کر لے گا تو جنت میں داخل ہو گا۔ لہٰذا دونوں روایتوں میں کوئی تعارض نہیں۔ البتہ حضرات محدثین کا اس میں اختلاف ہے کہ ننانوے اسماء حسنیٰ حضور اقدس صلی اللہ

(یعنی ننانوے نام جن کے ذریعہ ہم کو دعا کرنے کا حکم دیا ہے)

تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم ہی نے ارشاد فرمائے یا بعض رواتِ حدیث نے قرآن مجید کی آیات اور احادیث شریفہ کا تتبع کر کے ایک جگہ جمع کر دیا اور پھر حدیث کے ساتھ ملا کر روایت اور اس طرح سے حدیث میں ان اسماء کا ذکر مدرج ہو گیا۔ لیکن چونکہ ان اسماء میں سے اکثر تو ایسے ہیں جو قرآن مجید و حدیث میں بالتصریح موجود ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو آیات واحادیث کے مضامیں سے مستفاد ہوتے ہیں اس لیے ان کو یاد کر لینا اور دعا سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کے طور پر پڑھ لینا ان شاء اللہ قبولیت دعا کا ایک سبب اور وسیلہ ضرور ہے۔

فائدہ: اسمائے حسنیٰ کو بیک وقت پڑھ کر دعا کرنا چاہے تو اوپر جس طرح لکھا ہے۔

هو الله الذی لا اله الا هو الرحمٰن الرحیم۔

مسلسل پڑھتا ہے اور الصبور پر ختم کر کے دعا مانگ لے۔ مسلسل پڑھتے وقت ہر اسم کے آخری حرف پر پیش پڑھے اور اس پیش کو بعد والے اسم کے لام ساکن سے ملا دے بیچ میں الف کو چھوڑ دے۔ البتہ جن اسماء کے شروع میں حروف شمسیہ ہیں۔ (جن میں لام تعریف کا ادغام ہوتا ہے) وہاں پہلے اسم کے پیش کو دوسرے اسم کے حرف سے ملائے جو الف لام کے بعد ہے اور حروف شمسیہ جو اسماء حسنیٰ مذکورہ کے شروع میں ہیں۔ یہ ہیں، ت، ر، س، ش، ص، ض، ظ، ل، ن پڑھتے پڑھتے پڑھتے جب کسی جگہ سانس ٹوٹنے لگے تو وقف کر دے اور الحصی اور المحی اور الوالی اور التعالی اور المغنی اور الہادی اور الباقی پر وقف کرے تو یا کو ساکن کرے اور اس سے پہلے والے حروف پر زیر رہے۔

بعض اکابر نے فرمایا کہ اسماء حسنیٰ کو یکجا اکٹھا پڑھے تو ہر اسم کے بعد لفظ جل جلالہ بڑھا تا جائے۔ اس صورت میں جلالہ کی ہ حسب قاعدہ مذکورہ بعد والے اسم سے ملے گی اور جن کلموں کے آخر میں ی ہے (جن کا ابھی ذکر ہوا) ان کو وقف کے قاعدہ کے مطابق پڑھیں گے۔ ان باتوں کو کسی بڑے عالم یا صاحب فن قاری سے سمجھ لیں۔

اگر کسی ایک نام کا وظیفہ تو شروع میں یا لگا کر پڑھیں اور اس اسم سے الف لام حذف کر دیں۔ مثلاً اس طرح پڑھیں یا رحمٰن یا رحیم یا قدوس یا سلام وغیرہ لیکن لفظ اللہ کے شروع میں جو الف زبر کے ساتھ ہے (جو قواعد اور عربیہ کے مطابق ہمزہ ہے۔ وہ باقی رہے گا اور لام سے ملے گا۔)

ا۔جو بھی کوئی شخص ان کو خوب اچھی طرح یاد کرے گا جنت میں داخل ہو گا۔[7]

۲۔ان ناموں کو جو بھی کوئی ن شخص محفوظ کرلے گا ضرور جن ت میں داخل ہو گا۔[8]

چند دیگر اذکار

جن کے ذریعہ دعا کی جائے تو قبول ہوتی ہے:

اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کے ذریعہ دعا کرنا قبولیت دعا کا وسیلہ اور ذریعہ ہے۔ان اسماء کو بیان کرنے کے بعد مصنف رحمۃ اللہ علیہ چند دیگر اذکار وکلمات لکھتے ہیں جن کو احادیث شریفہ میں مقبولیت دعا کا ذریعہ ہوتا ہے۔

ا۔حضور انور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم نے ایک شخص کو یا ذوالجلال والا کرام(اے بزرگی اور اکرام والے)کہتے ہوئے سنا تو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم نے فرمایا،تیری دعا کی قبولیت کا فیصلہ کر دیا گیا ہے لہٰذا تو سوال کرلے گا۔[9]

۲۔فرمایا رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم نے کہ جو شخص یا ارحم الراحمین(اے سب رحم کرنے والوں مین سب سے زیادہ رحم کرنے والے)کہتا ہے اس کے لیے اللہ کی طرف سے ایک فرشتہ مقرر ہے۔پس جو شخص تین بار یہ کلمہ کہتا ہے تو فرشتہ اس سے کہتا ہے کہ ارحم الراحمین تیری طرف متوجہ ہے تو چاہے تو طلب کر۔[10]

ایک حدیث میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم کا ایک شخص کے پاس سے گزر ہوا،جو یاارحم الراحمین کہہ رہا تھا۔آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم

---

[7] بخاری،مسلم،ترمذی،نسائی،ابن ماجہ،حاکم،ابن حبان۔

[8] بخاری

[9] (ترمذی عن معاذ رضی اللہ عنہ)

[10] (حاکم عن ابی امامہ رضی اللہ عنہ)

نے اس سے فرمایاتو سوال کرلے، اللہ تعالیٰ نے تیری طرف نظر (کرم) فرمائی۔[11]

۳۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے تین بار جنت کا سوال کرتا ہے تو جنت کہتی ہے کہ اسے اللہ! اس کو جنت میں داخل فرما اور جو شخص دوزخ سے تین بار پناہ مانگتا ہے تو دوزخ کہتی ہے کہ اے اللہ! اس کو دوزخ سے پناہ میں رکھیو۔[12]

۴۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص ان پانچ کلمات کے ذریعہ دعا کرے۔ اللہ تعالیٰ سے جو کچھ بھی سوال کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کو عطا فرمائے گا۔

لا إلهَ إلّا اللهُ واللهُ أكبرُ لا إلهَ إلّا اللهُ وحدَه لا شريكَ له له المُلكُ وله الحمدُ وهو على كلّ شيءٍ قديرٌ لا إلهَ إلّا اللهُ ولا حولَ ولا قوّةَ إلّا باللهِ۔[13]

اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور وہی سب سے بڑا ہے ۔ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وہ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں اسی کی بادشاہی ہے اور اسی کے لئے حمد ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور برائی سے پھرنے اور نیکی کی قوت اللہ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں۔

دعا قبول ہو جانے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا

حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کسی شخص کو اپنی دعا کی قبولیت کا پتہ چل جائے پس قبولیت کے نتیجہ میں مرض سے شفا پا جائے یا (بخیر وعافیت) سفر سے واپس ہو جائے تو اسے کیا چیز روکتی ہے کہ یہ کلمات کہے۔[14]

---

[11] حاکم عن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

[12] ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن حبان، حاکم عن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

[13] الراوي: معاوية بن أبي سفيان • الطبراني، المعجم الأوسط (٢٧٩/٨)۔ الدمياطي، المتجر الرابح (٢٤٠)

[14] (مطلب یہ ہے کہ دعا کی قبولیت کا ظہور ہو جانے پر ان الفاظ سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کرو۔)

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ الَّذِي بِعِزَّتِہٖ وَجَلَالِہٖ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ۔[15]

ترجمہ: تمام تعریفیں اللہ پاک کے لئے جس کے غلبہ و بزرگی کے سبب اچھے کام پورے ہو جاتے ہیں۔

کائنات کو وجود کیسے ملا؟

کیا یہ خود بخود ظہور میں آگئی؟ کیا مادہ اپنا خالق خود آپ ہے؟ کیا عدم سے وجود میں لانے کے لئے کسی موجد کی ضرورت نہیں؟ کیا تخلیق بغیر کسی خالق کے ممکن ہے؟

قرآن مجید کی اس دلیل پر غور کیجئے:

أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ (٣٥) أَمْ خَلَقُوا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بَلْ لَا يُوقِنُونَ (الطور ٣٦)

کیا وہ کسی اصل سے نہ بنائے گئے یا وہی بنانے والے ہیں یا آسمان اور زمین انہوں نے پیدا کئے بلکہ انہیں یقین نہیں۔

جب کچھ بھی موجود نہیں تھا تو یہ آسمان، چاند، تارے، یہ زمین، سمندر اور پہاڑ کہاں سے آگئے؟ کیا کوئی شئے خود بخود عدم سے وجود میں آسکتی ہے؟ انسانی عقل صاف گواہی دیتی ہے کہ کسی موجود کا وجود بغیر موجد کے پایا جانا عقلاً محال ہے اس لیے کہ ہر ممکن الموجود پہلے عدم میں تھا، پھر وجود میں لایا گیا، تو لازم ہے کہ کوئی اس کا لانے والا ہو۔

انسانی عقل صاف گواہی دیتی ہے کہ کسی موجود شے کا خود ہی اپنا موجود ہونا عقلاً محال ہے کیونکہ اس سے شے کا وجود اس کی ذات سے پہلے آنا لازم ہوتا ہے جو عقلاً باطل ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ایک

---

15 (مستدرک، کتاب الدعاء والتکبیر...الخ، الدعاء اذا شفی...الخ، ۲/ ۲۴۱، حدیث: ۲۰۴۳)

شے جو ابھی تک موجود ہی نہیں ہے۔ حالت عدم میں ہے۔ لاشے ہے، خالق نہیں بن سکتی، یعنی ابھی تو وہ سرے سے موجود ہی نہیں، کجا یہ کہ وہ وجود میں آنے والی شے کی موجد بن جائے۔

توثابت ہوا کہ ایک شے کا بیک وقت مخلوق وخالق ہونا ممکن ہے۔ کیونکہ وجود میں آنے سے پہلے اس کا کسی طرح سے وجود نہیں کجا کہ وہ اپنی تخلیق کا سامان پیدا کرے۔

چنانچہ تخلیق کائنات کی اس کے علاوہ اور کوئی توجیہ ممکن نہیں کہ ایک خالق و مدبر کے وجود کو مانا جائے۔ فلسفہ قدیم میں خدا کے وجود پر یہی دلیل کچھ اس انداز سے بیان کی گئی ہے:

ہمارے حواس خمسہ پورے یقین کے ساتھ ہمیں اس فیصلہ پر پہنچادیتے ہیں کہ اس دنیا میں کچھ چیزیں حرکت کر رہی ہیں (یعنی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہورہی ہیں یا گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں یا ان میں کسی اور قسم کا تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے)۔ دوسری یقینی بات یہ ہے کہ کوئی چیز اس وقت تک حرکت نہیں کرتی جب تک کہ کوئی دوسری قوت یا کوئی دوسری چیز اسے حرکت میں نہ لائے۔ ایک چیز خود اپنے آپ کو حرکت نہیں دے سکتی کیونکہ اس سے یہ بات لازم آئے گی کہ وہ ایک ہی وقت میں خود ساکن بھی ہے اور متحرک بھی جو عقلاً محال ہے۔

چناچہ ی بات طے ہوئی کہ جو چیز بھی حرکت کر رہی ہے اس کو کوئی اور چیز حرکت میں لائی ہے اور اس حرکت میں لانے والی چیز کو بھی کوئی اور چیز حرکت میں لائی تھی۔ اب اس حرکت میں لانے والی چیز کو بھی کوئی اور چیز حرکت میں لائی۔ یونہی اور پر کی طرف بڑھتے جایئے، ہر محرک کا ضرور کوئی نہ کوئی محرک ہونا چاہیے لیکن محرکوں (حرکت میں لانے والی اشیاء) کا یہ سلسلہ لامتناہی نہیں ہو سکتا ۔کیونکہ اگر محرکوں کا یہ سلسلہ لامتناہی مان لیا جائے تو یہ بات لازم آئے گی کہ کوئی بھی محرک اول نہیں ہے۔ یعنی ایسی کوئی چیز نہیں ہے جس نے سب سے پہلے حرکت پیدا کی اور اگر یہ مان لیا جائے کہ

کوئی محرک اول نہین ہے اور کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس نے سب سے پہلے حرکت دی ہو تو لازماً یہ بھی ماننا پڑے گا کہ حرکت کو وجود ناپید ہے۔ جب محرک اول ہی نہیں ہے تو حرکت کہاں سے آ گئی۔ لازم حرکت کی نفی کرنا پڑے گی۔

لیکن حرکت کے وجود کے انکار کی قطعاً گنجائش نہیں۔ اس کے وجود کا فیصلہ تو شروع ہی میں ہمارے حواس خمسہ دے چکے ہیں۔ چناچہ ہمیں لازماً محرک اول کا وجود ماننا پڑے گا۔ ایسے محرک نے حرکت دے تو دی لیکن وہ خود حرکات کا محتاج نہیں تھا۔ بالفاظ دیگر ایسا خالق جس نے دوسری اشیاء کی تخلیق تو کی لیکن خود اس کی کسی نے تخلیق نہ کی۔

دیکھئے سورۃ اخلاص میں ایسے ہی خالق کی صفات بیان کی گئی ہیں:

قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ (1) اللَّهُ الصَّمَدُ (2) لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ (3) وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ (4)(سورۃ اخلاص)۔

ترجمہ: تم فرماؤ وہ اللہ ہے وہ ایک ہے اللہ بے نیاز ہے نہ اس کی کوئی اولاد اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا اور نہ اس کے جوڑ کا کوئی۔

اب قرآن مجید کی ان آیات پر غور کیجیۓ۔ بات واضح ہو جائے گی:

وَأَنَّ إِلَى رَبِّكَ الْمُنْتَهَى (سورۃ النجم: ۴۲)۔

ترجمہ: اور یہ کہ بے شک تمہارے رب ہی کی طرف انتہا ہے۔

وَلِلَّهِ غَيْبُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَإِلَيْهِ يُرْجَعُ الْأَمْرُ كُلُّهُ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ (سورۃ هود: ۱۲۳)۔

ترجمہ: اور اللہ ہی کے لیے ہیں آسمانوں اور زمین کے غیب اور اسی کی طرف سب کاموں کی رجوع ہے تو اس کی بندگی کرو اور اس پر بھروسہ رکھو اور تمہارا رب تمہارے کاموں سے غافل نہیں۔

خلاصہ بحث یہ ہوا کہ خدا کہ وجود کے علاوہ تخلیق کائنات کی کوئی اور توجیہ ممکن نہیں۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں کچھ منکرین خدا نے اس مسئلہ پر آکر بحث کرنا چاہی تو آپ نے مندرجہ ذیل حکیمانہ انداز میں ان کی تشفی فرمائی:

فرمایا"چھوڑو چھوڑو، میں ایک فکرمیں مستغرق ہوں۔ لوگوں نے مجھ سے ذکر کیاہے کہ سمندر میں ایک کشتی کھڑی ہے جس میں قسماقسم کے سامانِ تجارت ہیں، کوئی اس کا محافظ یا چلانے والا نہیں ہے اور وہ خود بخود آتی جاتی ہے، خود بخود تند وریز موجوں کا مقابلہ کرتے ہوئے جہاں جاتی ہے صاف بچ کر نکل جاتی ہے اور ساحل پر پہنچ جاتی ہے اور اس کا کوئی چلانے والا نہیں ہے۔"

زندیق کہنے لگے:"یہ ایسی بات ہے جو کوئی عقل مند انسان نہیں کہہ سکتا۔"

فرمایا: ظالمو! پھر یہ نظامِ شمسی، یہ عالمِ بالا اور عالمِ سفلی اور اس میں جس قدر مضبوط حکم و مصالح سے پر اشیاء موجود ہیں ان کا خالق و مدبر کوئی نہیں ہے؟ کیا یہ بات کسی کے قل و تصور میں آسکتی ہے؟ اسی طرح سے ایک بدو گنوار سے کسی نے خدا کی ہستی کی دلیل دریافت کی تو اس نے اپنے سادہ اسلوب میں خوب جواب دیا۔

البعرۃ تدل علی البعیر و اثار الاقدام لتدل علی المسیر فالسماء ذات ابراج و الارض ذات فجاج و بحار ذات امواج کیف لا تدل علیٰ وجود اللطیف الخبیر۔

مینگنی اونٹ کے وجود پر دلالت کرتی ہے (یعنی مینگنی کا نظر آجانا اس بات کی دلیل ہے کہ ضرور اونٹ یہاں سے گزرا ہے) اور قدموں کے نشان کسی چلنے والے کا پتہ دیتے ہیں۔ پھر یہ کیا بات ہوئی کہ بڑے بڑے برجوں والا آسمان اور بڑی بڑی گھاٹیوں والی زمین اور موجوں والے سمندر کسی لطیف وخبیر ذات کے وجود پر دلالت نہ کریں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ کوئی مادی شے خود اپنی تخلیق پر قادر نہیں ہو سکتی ہے۔ یہ کائنات از خود اپنے آپ کو پیدا نہیں کر سکتی۔ اگر کائنات از خود پیدا ہو سکتی ہے اور تخلیق کی قوت سے متصف ہے جسے ہم خدا کی صفت قرار دیتے ہیں تو پھر ہم اس کائنات کو ہی خالق یا خدا قرار دے رہے ہیں مگر یہ بہت عجیب قسم کا خدا ہو گا جو مادہ بھی ہو گا اور مادہ سے بلند تر بھی۔ کو خود فطرت بھی ہو گا اور مافوق الفطرت بھی، جو خود خالق بھی ہو گا اور مخلوق بھی، ایسا خدا خود حاکم بھی ہو گا اور محکوم بھی۔ آخر ایسے مہمل تصور خدا کو قبول کرنے کی بجائے ایک سیدھے سادھے تصور خدا کو کیوں نہ مان لیا جائے جس میں کوئی عقلی و منطقی جھول نہ ہو۔ ایسا خدا جس نے ایک عالم مادی کی تخلیق کی ہے، وہ خود اس کا جزو نہیں بلکہ اس کا خالق اور حاکم ہے۔

تخلیق کائنات کی مادی توجیہ سے ایک اور غیر منطقی صورت بھی پیش آسکتی ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ کائنات از خود پیدا ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے تو کائنات کے ایک ایک ذرہ کو تخلیق کی خدائی صفت سے ماننا پڑے گا۔ ہر ہر ذرہ اپنی اپنی جگہ پر خالق، ہر ہر ایٹم اپنی جگہ پر خدا لیکن جدید دور کی سائنس تو بڑی وثوق سے ہمیں بتلا رہی ہے کہ کوئی ذرہ خود مکتفی اکائی نہیں ہے، کوئی ذرہ تن تنہا اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتا۔ ہر ذرہ اپنے وجود کے لیے دوسرے ذرے کا محتاج ہے۔ ہر ذرہ خارجی مدد کا محتاج ہے تو وہ ذرہ کائنات جو اپنے تئیں اپنے وجود کو برقرار نہیں رکھ سکتا، تخلیق کا عمل کس طرح نباہ کر سکتا ہے؟

پھر جدید دور کی سائنسی تحقیقات نے حتمی طور پر بتلا دیا ہے کہ ان ذرات کا آپس میں بہت ہی گہرا نظم و ربط ہے۔ اس نظم و ربط کے بغیرت کائنات کی تخلیق، اس کا وجود اور اس کا ارتقاء سب کچھ ناممکن ہے۔ سائنسی تحقیق کہتی ہے کہ ان نہایت حقیر سے ذرات نے جن کی حقیقت و ماہیت کو

ہمارے لیے دیکھنا بھی مشکل ہے، کروڑہا بلکہ ارب ہا ایسے ستاروں اور سیاروں کو وجود بخشا ہے جن کی ہیئت متعین اور ان کی ہیئت کا بیان ممکن ہے جو اصل قوانین کے تحت قائم و متحرک ہیں۔ان ستاروں اور سیاروں کی ترکیب وتربیت کمال حکمت سے، جو مادی فہم وادراک سے بلند تر ہے، انتہائی چھوٹے چھوٹے ذرات سے کی گئی ہے اور پھر ان ذرات کے اندر خود بھی وہی نظام چھوٹے پیمانے پر قائم اور جاری ہے۔ یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان ارب ہا ذرات میں یہ ہم آہنگی اور نظم وربط کہاں سے آگیا؟

پھر انہی ذرات سے نہ صرف ستارے اور سیارے وجود میں آئے بلکہ کروڑہا ذی روح ہستیاں بھی پیدا ہو گئی ہیں۔ایک زندہ انسان کس طرح سے عالم وجود میں آگیا؟ اگر کائنات کا ہر بے بس اور بے جاذرہ اپنے آپ کو پیدا کر سکتا ہے تو میں تو ایک زندہ اور باشعور ہستی ہوں، ایک بے بس ذرے سے زیادہ طاقت ور، زیادہ باشعور، زیادہ تخلیقی قوتوں کا مالک، میں اپنے آپ سے پورے خلوص اور دیانت کے ساتھ پوچھتا ہوں کہ کیا میں نے اپنے آپ کو خود پیدا کیا ہے؟ اور اپنے آپ کو از خود پیدا کر لینے کے بعد میں اپنے نظام جسم کو اپنی مرضی کے مطابق چلا رہا ہوں؟ کیا دل کی دھڑکن میرے حکم کے مطابق ہو رہی ہے؟ کیا جگر، پھیپھڑے، گردے اور دیگر تمام اعضائے جسمانی کوئی کام کرنے سے پہلے میرے حکم کے منتظر رہتے ہیں اور میری مرضی کو پورا کرتے ہیں، کیا میرے سر کے بال میری مرضی سے گرتے ہیں، میری داڑھی کے بال میری مرضی کے مطابق سفید ہو رہے ہیں ۔میرے چہرے پر جھریاں میری اجازت سے پڑ رہی ہیں؟ دل صاف گواہی دے رہا ہے کہ یہ سب کچھ میں نے خود نہیں کیا اور میں نہیں کر سکتا۔ایک قوت، ایک ہستی جو میرے علاوہ کوئی اور ہے ۔۔۔کم از کم میں خود نہیں ہوں۔۔۔جو میرے پورے نظام جسمانی کو سنبھالے ہوئے اور اس قدر

چابک دستی اور صحت کے ساتھ سنبھالے ہوئے ہے کہ میں اس کے نظام کو اور اس کی حکمتوں کو پوری طرح سے سمجھ بھی نہیں سکتا اور عام انسانوں کی اکثریت تو اتنی بات سے بھی واقف نہیں کہ ان کا جسم کا سارا نظام کس طرح سے وجود میں آ گیا اور اب کس طرح سے چل رہا ہے؟ جگر کہاں واقع ہے؟ اف! انسان کی بے بسی! اس انسان کی بے بسی جو اس کائنات کی مضبوط ترین اور ذہین ہستی ہے! ہائے انسان کی بے بسی خود اپنے جسم کے بارے میں، خود اپنے جسم کی تخلیق اور نظام عمل کے بارے میں اور خود اس نظام کو سمجھ سکنے کے بارے میں!

قابل غور بات یہ ہے کہ جب انسان اپنی تخلیق اور اپنے جسمانی نظام کو چلانے کے بارے مین بے بس تو ایک جان دار، بے شعور اور بے بس ذرہ کائنات اپنی تخلیق خود کس طرح سے کر سکتا ہے؟ پھر کس طرح سے مادہ خود اپنا خالق اور اپنا ناظم بن گیا؟ پھر کس طرح سے یہ کائنات از خود پیدا بھی ہو گئی، از خود ارتقاء پذیر بھی ہو گئی اور از خود پورا نظام کائنات نظم وضبط کی تمام باریکیوں سمیت خود بخود صحت سے جاوی وساری ہے؟ اب تک تو ان نشانیوں کا ذکر کیا گیا جو مجموعی طور پر اس پوری کائنات میں نظر آتی ہیں۔ آیئے اب کچھ ان نشانیوں کا تذکرہ کریں جو جمادات، نباتات، حیوانات بلکہ خود انسان کی شکل میں اس زمین پر بکھری ہوئی ہیں۔

جمادات اور رحمت

قرآن مجید میں ہے:

وَهُوَ الَّذِي مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هَذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَهَذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَحِجْرًا مَحْجُورًا (سورۃ الفرقان:۵۳)۔

ترجمہ: اور وہی ہے جس نے ملے ہوئے رواں کیے دو سمندر یہ میٹھا ہے نہایت شیریں اور یہ کھاری ہے نہایت تلخ اور ان کے بیچ میں پردہ رکھا اور روکی ہوئی آڑ۔

"یہ کیفیت ہر اس جگہ رونما ہوتی ہے جہاں کوئی بڑا دریا سمندر میں آگرتا ہے۔ اس کے علاوہ خود سمندر میں بھی مختلف مقامات پر میٹھے پانی کے چشمے پائے جاتے ہیں۔ جن کا پانی سمندر کے نہایت تلخ پانی کے درمیان بھی اپنی مٹھاس پر قائم رہتا ہے۔ ترکی امیر البحر سیدی علی رئیس (کاتب رومی) اپنی کتاب مرآۃ الممالک میں جو سولہویں صدی عیسوی کی تصنیف ہے، خلیج فارس کے اندر ایسے ہی ایک مقام کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس نے کہا کہ وہاں آب شور کے نیچے آب شیریں کے چشمے ہیں جن سے میں خود اپنے بیڑے کے لیے پینے کا پانی حاصل کرتا ہوں۔ موجودہ زمانے میں جب امریکن کمپنی نے سعودی عرب میں تیل نکالنے کا کام شروع کیا تو ابتداء وہ بھی خلیج فارس کے انہی چشموں سے پانی حاصل کرتی تھی۔ بعد میں ظہران کے پاس کنوئیں کھود لیے گئے اور ان سے پانی لیا جانے لگا۔"[16]

تلخ و شور پانی کے عین درمیان میٹھے پانی کا وجود سوائے ایک اخلاق عظیم کے تخلیق شاہکار کے اور کیا ہو سکتا ہے جسے اپنی مخلوق کی تکلیف و پیاس گوارا نہیں۔ اس نے اپنے عظیم منصوبہ کے تحت اس جگہ بھی میٹھے پانی کا انتظام فرمادیا جہاں عام حالات میں میٹھے پانی کا وجود ممکن نہیں۔

پھر سمندر کے اس تلخ و شور پانی میں سے انتہائی احتیاط کے ساتھ پانی کشید کیا جاتا ہے اور انتہائی صاف، شفاف اور شیریں پانی بادلوں کی پیٹھ پر سوار کرکے بالائی علاقوں تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ اتنے کروڑ پانی میں سے میٹھا پانی نکال لانا اگر تخلیقی فن پارہ نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ کیا اس خلاق عظیم کے لیے یہ زیادہ آسانی سے ممکن نہ تھا کہ کڑوے کا کڑوا پانی ہی بادلوں میں بھر دیا جاتا نہ یہ پانی پینے کے

---

[16] تفہیم القرآن، جلد سوم ص ۴۵۸

کام آسکتا اورنہ آب پاشی کے ،بلکہ جس جس زمین تک یہ پہنچ جاتا اس کی زرعی استعداد بھی تباہ ہو جائی
؟

أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ أَأَنْتُمْ أَنْزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُونَ لَوْ نَشَاءُ جَعَلْنَاهُ أُجَاجًا فَلَوْ لَا تَشْكُرُونَ۔

ترجمہ: تو بھلا بتاؤ تو وہ پانی جو پیتے ہو کیا تم نے اسے بادل سے اتارا یا ہم ہیں اُتارنے والے ہم چاہیں تو اُسے کھاری کر دیں پھر کیوں نہیں شکر کرتے۔

بارش کے چھینٹے اتفاقاً ہی زمین پر نہین گر جاتے بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک زبردست قسم کا نظام ہے جس سے انسانی زندگی رواں دواں ہے۔ اگر بارش کے چھینٹے محض اتفاق کا نتیجہ ہوتے تو کبھی تو ایسا ہوتا کہ کسی علاقے میں خوب بارش ہو جائی اور کبھی ایسا ہوتا کہ کئی کئی سال تک وہاں ایک چھینٹا بھی نہ پڑتا۔ اس کے برعکس صورتحال یہ ہے کہ بارش کا زمین کے تمام خطوں کے لیے ایک مخصوص کونہ مقرر ہے جو ہر صورتحال یہ ہے کہ بارش کا زمین کے تما خطوں کے لیے ایک مخصوص کوٹہ مقرر ہے جو ہر سال صحیح وقت پر مل جاتا ہے۔ انسانی آبادی شروع سے لے کر اب تک بارش کے اس مخصوص کوٹے سے وابستہ چلی آرہی ہے اور پھر ایسا نہیں ہوتا کہ ایک مرتبہ بارش ہو گئی اور سال بھر پانی کو ترستے رہے بلکہ بارش کا پانی پہاڑوں پر کہیں جھلیوں کی شکل میں کہیں برف کی شکل میں اسٹاک کر دیا جاتا ہے اور یہ اسٹاک اربوں من برف کی شکل میں سال بھر تھوڑا تھوڑا نشیبی علاقوں کی طرف سپلائی ہوتا رہا ہے۔ بارش کا ایک اور کمال دیکھئے:

وَمِنْ آيَاتِهِ يُرِيكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَيُحْيِي بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ (سورۃ الروم: ۲۴)۔

ترجمہ: اور اس کی نشانیوں سے ہے کہ تمہیں بجلی دکھاتا ہے ڈراتی اور امید دلاتی اور آسمان سے پانی اُتارتا ہے تو اس سے زمین کو زندہ کرتا ہے اس کے مرے پیچھے بے شک اس میں نشانیاں ہیں عقل والوں کے لیے۔

یہ بجلی بھی خوب رہی، اس میں خوف بھی ہے اور طمع بھی۔ خوف تو بجلی کے گر جانے سے تباہی کا اور طمع اس بات سے زمین سیراب ہو گی۔ جدید سائنس نے ایک اور انکشاف بھی بجلی کے بارے میں کیا ہے کہ اس کے کڑک سے بارش کے پانی میں کثیر مقدار میں نائٹروجن ملادی جاتی ہے ۔ وہی نائٹروجن جو کھاد کا جزو عظیم ہے۔ نائٹروجن سے ملا ہوا یہ پانی جب زمین پر گرتا ہے تو زمین کی زرعی قوت کو کئی بڑھادیتا ہے۔

یہ پہاڑ جو ہمارے لیے برف اور پانی کا ذخیرہ ہیں ایک اور اہم کام انجام دیتے ہیں وہ یہ کہ پہاڑ زمین کے توازن کو برقرار رکھتے ہیں، وہ زمین جس کے پیٹ میں کھولتے ہوئے آتش فشاں، انتہائی گرم سیال مادے اور گیسیں موجود ہیں کبھی سکون سے اپنی سطح سی برقرار نہیں رکھ سکتی، اگر پہاڑوں کی لمبی لمبی میخیں اس کے پیٹ میں نہ گاڑی جاتیں۔ یہ بات قرآن مجید میں یوں بیان کی گئ:

أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ مِهَادًا (6) وَالْجِبَالَ أَوْتَادًا (سورة النباء:۷،٦)۔

ترجمہ: کیا ہم نے زمین کو بچھونا نہ کیا اور پہاڑوں کو میخیں۔

نیز فرمایا:

وَأَلْقَى فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِكُمْ (سورة لقمان:۱۰)۔

ترجمہ: اور زمین میں ڈالے لنگر کہ تمہیں لے کر نہ کانپے۔

آگ کے وجود کو بھی قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی قرار دیا ہے۔

أَفَرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ أَأَنْتُمْ أَنْشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا أَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُونَ۔

ترجمہ: ”تو بھلا بتاؤ تو وہ آگ جو تم روشن کرتے ہو کیا تم نے اس کا پیڑ پیدا کیا (ف ۵۶) یا ہم ہیں پیدا کرنے والے“۔

ہوا، پانی اور زمین کی نعمتوں کی طرح آگ بھی انسانی زندگی کے لیے نہایت ضروری ہے۔ یہ بات سوچنے کی ہے کہ یہ سب چیزیں کس نے پیدا کی ہیں؟ کیا یہ خود بخود وجود میں آ گئیں؟ کیا انسان نے ان کو پیدا کیا؟ کیا ان کو پیدا کرنے کے بعد ان کا نظام انسان چلا رہا ہے؟ کیا آگ اور پانی میں کوئی ایسا سمجھوتہ ہے جس کے تحت یہ دونوں اپنے اپنے وجود کو اور ایک بہترین نظام کو برقرار رکھے ہوئے ہیں؟

اگر انسان کی عقل سلامت ہے تو ہو یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ فطرت کی یہ بے پناہ اور بے حد وحساب پھیلی ہوئی اندھی بہری قوتیں خود کو پیدا کرنے اور پھر آپس میں نظم وربط قائم رکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں، ان کی تخلیق و تنظیم کے لیے ایک قدیر و بصیر خالق کا وجود ماننے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔

نباتات اور رحمت

نباتات کی پیدائش میں بھی اللہ تعالیٰ کے وجود کی بے پناہ نشانیاں ہیں:

وَ آيَةٌ لَهُمُ الْأَرْضُ الْمَيْتَةُ أَحْيَيْنَاهَا وَ أَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَأْكُلُونَ وَ جَعَلْنَا فِيهَا جَنَّاتٍ مِنْ نَخِيلٍ وَأَعْنَابٍ وَفَجَّرْنَا فِيهَا مِنَ الْعُيُونِ لِيَأْكُلُوا مِنْ ثَمَرِهِ وَمَا عَمِلَتْهُ أَيْدِيهِمْ أَفَلَا يَشْكُرُونَ (سورۃیٰس: ۳۵،۳۳)۔

ترجمہ: اور ان کے لیے ایک نشانی مردہ زمین ہے ہم نے اسے زندہ کیا اور پھر اس سے اناج نکالا تو اس میں سے کھاتے ہیں اور ہم نے اس میں (ف ۴۱) باغ بنائے کھجوروں اور انگوروں کے اور ہم نے

اس میں کچھ چشمے بہائے کہ اس کے پھلوں میں سے کھائیں اور یہ ان کے ہاتھ کے بنائے نہیں تو کیا حق نہ مانیں گے۔

ایسے ہی ایک اور جگہ یوں فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَ النَّوٰى يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَأَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ۔

ترجمہ: بیشک اللہ دانے اور گٹھلی کو چیرنے والا ہے زندہ کو مردہ سے نکالے اور مردہ کو زندہ سے نکالنے والا یہ ہے اللہ تم کہاں اوندھے جاتے ہو۔

قابل غور بات یہ ہے کہ زمین سے اناج اور پھلوں کے باغات کا پیدا ہونا اتنا آسان کام نہیں ہے ۔اس زمین سے گندم کا ایک دانہ بھی اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ کائنات کی بے شمار چیزیں مل کر پورے تعاوہ اور نظم وضبط کے ساتھ اپنی قوتیں ایک بیج کے دانے پر موکوزنہ کردیں۔ زمین کی زرعی قوت ،پانی خاص قسم کا درجہ حرارت ،بروقت بارش ،سورج کی گرمی، آکسیجن اور نائٹروجن کا عمل غرض یہ کہ بے شمار عوامل اپنی اپنی جگہ سے ایک بیج کے دانے پر اپنی قوتیں صرف کررہے ہیں۔۔اگر سورج کی گرمی کم یازیادہ ہو جائے ،اگر زمین کی زرخیزی کم یازیادہ ہو جائے، اگر سمندر سے بادل آکر بارش نہ برسائیں اور موسم ٹھیک وقت پر اس بیج کی چاکری نہ کریں تو اناج کا یہ دانہ اور کسی بیج کا کوئی پوادا بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ معلوم یہ ہوا کہ سمندر ،ہوا، بارش، سورج، زمین مختلف گیسیں اور اسی طرح بے شمار مختلف قوتیں کسی ایسی بڑی قوت کے ماتحت ہیں جو انہیں ایک نظام میں باندھے ہوئے ہے جس نظام کے تحت یہ ٹھیک ٹھیک وقت پر، ٹھیک ٹھیک نسبت ہے باہمی تعاون کرتے ہوئے اس بیج کی چاکری کرتی ہیں اور وہ بیج پودے کی شکل میں سے بڑھتا ہے، بیچارے کسان کا

کام تو صرف اتنا ہی ہے کہ زمین کو نرم کرنے کے بعد اس میں بیج ڈال دے اور پھر اناج کے لیے خدا کی رحمت کا منتظر ہے۔ یہ بات قرآن مجید میں یوں بیان کی گئی ہے:

أَفَرَأَيْتُم مَا تَحْرُثُونَ أَأَنْتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ وَ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُونَ إِنَّا لَمُغْرَمُونَ بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ (سورۃ الواقعہ:٦٣۔٦٧)۔

ترجمہ: تو بھلا بتاؤ تو جو بوتے ہو کیا تم اس کی کھیتی بناتے ہو یا ہم بنانے والے ہیں ہم چاہیں تو اسے روندن (پامال) کر دیں پھر تم باتیں بناتے رہ جاؤ کہ ہم پر چٹی (تاوان) پڑی بلکہ ہم بے نصیب رہے۔

تو معلوم ہوا کہ کاشت کرنا تو انسان کے بس میں ہے لیکن کھیتی کا اگانا اور پودے کو بڑھانا ان کے بس میں نہیں ہے۔

پھر نباتات میں بھی زندگی کا پورا نظام موجود ہے۔ قرآن مجید نے آج سے ڈیڑھ ہزار برس پہلے اس نظام کی نشان دہی کی بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ ان میں بھی نر مادہ موجود ہیں۔

وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ (سورۃ لقمان:١٠)۔

ترجمہ: ہم نے آسمان سے پانی اُتارا تو زمین میں ہر نفیس جوڑا اُگایا۔

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند
تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری
ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرمان بردار
شرط انصاف نہ باشد کہ تو فرماں نہ بری

فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ إِلَى طَعَامِهِ أَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا (سورۃ عبس:٢٦،٢٤)۔

ترجمہ: تو آدمی کو چاہیے اپنے کھانوں کو دیکھے کہ ہم نے اچھی طرح پانی ڈالا پھر زمین کو خوب چیرا۔

حیوانات اور رحمت

یوں معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کہ ہر چیز انسان کی خدمت کے لیے بنائی گئی ہے۔زمین پر بے شمار قسم کے جانور پیدا کیے گئے اوران کی ساخت بتائی ہے کہ یاتو یہ سواری کے لیے بنائے گئے ہیں یا بار برداری کے لیے اور یا پھر خوراک کا کام دے سکتے ہیں۔

قرآن مجید میں ہے:

وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيكُمْ مِمَّا فِي بُطُونِهِ مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَدَمٍ لَبَنًا خَالِصًا سَائِغًا لِلشَّارِبِينَ (سورة النحل: ٦٦)

ترجمہ: اور بے شک تمہارے لیے چوپایوں میں نگاہ حاصل ہونے کی جگہ ہے ہم تمہیں پلاتے ہیں اس چیز میں سے جو ان کے پیٹ میں ہے گوبر اور خون کے بیچ میں سے خالص دودھ گلے سے سہل اترتا پینے والوں کے لیے۔

سچی بات یہ ہے کہ اگر دودھ کی پیدائش کے نظام پر ہی غور کیا جائے تو نسان ششدر رہ جاتا ہے ۔پیٹ میں ایک طرف ناپاک اور غلیظ گوبر اور دوسری طرف بدبودار خون۔ لیکن ان دونوں کے درمیان جو چیز پیدا ہورہی ہے وہ انتہائی صاف ،خوشگوار اور خوشبودار ہے اور انسانی زندگی کے لیے نہایت ضروری ہے۔اگر انسانی عقل ضد کی وجہ سے اندھی نہ ہوگئی ہو تو ایک ایسی ہستی کا وجود جو ماؤں

میں مامتا پیدا کر دیتا ہے اور مامتا کے ذریعے دودھ پلا دیتا ہے، سورج کی روشنی سے زیادہ عیاں نظر آتا ہے۔

انسان کی بساط تو فقط اتنی ہے کہ وہ ایک مکھی تک پیدا نہیں کر سکتا۔ پیدا تو کیا کرے گا اگر مکھی اس کے کھانے سے کچھ چھین کر لے جائے تو وہ بھی واپس نہیں لا سکتا۔

إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَنْ يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوِ اجْتَمَعُوا لَهُ وَإِنْ يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَا يَسْتَنْقِذُوهُ مِنْهُ (سورۃ الحج:۷۳)۔

ترجمہ: وہ جنہیں اللہ کے سوا تم پوجتے ہو ایک مکھی نہ بنا سکیں گے اگرچہ سب اس پر اکٹھے ہو جائیں اور اگر مکھی ان سے کچھ چھین کر لے جائے تو اس سے چھڑا نہ سکیں۔

مشاہدات اور قدرتِ الٰہیہ

اول مشاہدہ۔ وحدانیت باری تعالیٰ:

مولانا محمد ابراہیم دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اللہ اکیلے کی ہستی کا تعین کرنا ہر ایک انسان کے لیے فرض ہے کیونکہ جہاں کی ہستی انسان کو مجبور کرتی ہے صانع اور خالق کے مان لینے پر مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ہیچ چیزے خود بخود چیزے نہ شد
ہیچ آہن خود بخود تیغے نہ شد

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ عالم میں دو قسم کی چیزیں موجود ہیں ایک انسانی مصنوعات، ایک قدرت کی بنائی ہوئی چیزیں پس جس طرح انسانی مصنوعات میں لوہا خود بخود تلوار نہیں بن سکتا جب تک کوئی لوہار نہ بنائے اسی طرح لوہا بھی زمین کے اندر خود بخود نہیں بن سکتا۔ جب تک مولیٰ نہ بنائے افسوس

ہے ان دہریوں خدا کے منکروں پر کہ ان کے نزدیک انسانی مصنوعات خود بخود عناصر کے ملنے سے نہیں بن سکتیں مگر قدرتی مصنوعات مخلوقات خود بخود اربعہ عناصر کے میل سے بغیر صائع کے پار ہو جائیں وجہ افسوس کی یہ ہے کہ وہ باریک ذرے جن سے مخلوقات تیار کی جاتی ہے اگر ان کو کسی عالم عاقل بالغ کے ماتحت تسلیم نہ آجائے یہ ضرور ماننا ہو گا کہ وہ ذرات ذی شعور اور بہت بڑے ذی شعور ہیں جو ہر چیز کے کیمیاوی اجزاء کو ایسے مناسب طریق سے باہم ملاتے ہیں کہ دنیا میں کوئی انسان عقل مند سے عقل مند بڑی بڑی کمیٹی بھی نہیں ملا سکتی۔ مثلاً سونا زمین سے پیدا ہوتا ہے مگر انسان باوجود قل کے ایسے اجزاء نہیں ملا سکتا اسی طرح نیم کے کڑوے درخت میں پھل کا شیریں پیدا ہونا کاری گری پر دلالت کرتا ہے کہ جو انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ لوہے مقناطیس می کشش کا پیدا نہیں کر سکتا اسی طرح ہزار ہا اشیاء کی ساخت لاکھوں درخت اور پھول ایسے ہیں کہ سارے جہاں کے عقل مند مل کر ایک پتی بھی نہیں بنا سکتے تب معلوم ہوا کہ اربعہ عناصر کے ذرات نہایت درجہ کے عقل مند ذی شعور ہیں کہ ان کی مثل کوئی عقل مند نہیں ہو سکتا اور عناصر یا ذرات کا ذی شعور کہنا بدہستہ باطل ہے۔ پس ضرور ہوا کہ ان ذرات سے عالم کا بنانے والا کوئی زبردست عقل مند ذی شعور ذات ہ ورنہ اربعہ عناصری یا ان ذرات کی توحیات بھی محقق نہیں ہوئی اور کجا ان کا شعور پھر شعور بھی ایسا کہ جو جہان بھر کو عاجز کرتا ہو بالضرور یہ قول حق ہے:

ایں سبب ہا ور نظــر ہا پردہاست
درحقیقتــــ فــاعــل ہر شے خداست

دوسرا مشاہدہ وحدانیت باری تعالیٰ:

بہت سی ایسی مشینیں ایجاد ہوئیں جو پھولوں کے کیمیاوی اجزاء کو الگ الگ تو کرتی ہیں۔ مثلاً املی سے گوند، شکر ترشی پانی بھوسی جدا جدا کر دیتی ہیں مگر ہم تو جب جانیں کہ جو اجزاء جدا کیے ہیں ان کو کوٹ کر ملا کر پھر ویسی املی تیار ہو جائے اگر وہ اجزاء ملائے بھی جاتے ہیں اور کوئی مہمل سی شے تیار ہو جاتی ہے اور وہ مثل صادق آتی ہے کہ تیرا پہلا روپ بھی کھو دوں تو کیا دے گا۔ جب عقل مند انسان کی بڑی سے بڑی جماعت املی کے اجزاء معلوم ہونے کے بعد املی تیار نہ کر سکے پھر وہ ذات حیات بھی نہیں۔ ذی شعور کہاں سے ہوں گے ان ذرات میں بڑے زور لگانے سے صرف ایک حرکت مضطربانہ باہم ملنے کی بتائی گئی ہے جو کسی طرح کافی نہیں ہو سکتی پھر وہ ذرات یہ پھل پھول یہ میوے یہ باغات یہ سونا چاندی یہ جواہرات یہ حیوانات یہ خوبصورت آدمی وغیرہ وغیرہ کسی طرح بنا سکتے ہیں۔ قرآن کا فرمانا بالکل درست ہے۔ اللہ خالق کل شئ بے شک اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے۔ وھو بکل شیء علیم اور وہ ہر چیز کی ساخت کا علم رکھتا ہے۔ پھر اگر اربعہ عناصر اور وہ ذرات بھی موجد وخالق کا ہونا لازم ہوا۔ پھر جو عناصر کا خالق ہے وہی سب کا خدا ہے پھر اگر اربعہ عناصر اور وہ ذات بھی حادثات ہیں جیسا کہ بعض محققین یورپ کی تحقیق سے ثابت ہوا ہے تب تو پھر ان کے لیے بھی موجد وخالق کا ہونا لازم ہوا پھر جو عناصر کا خالق ہے وہی سب کا خدا ہے۔

تیسرا مشاہدہ وحدانیت باری تعالیٰ:

حکایت: خلفائے عباسیہ کی حکومت کے زمانہ میں حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا ایک دہریہ (خدا کی ہستی کے منکر) سے مناظرہ مقرر ہوا اور زیر بحث یہی مسئلہ تھا کہ عالم کا کوئی خالق ہے یا نہیں۔ اول تو مناظرہ پھر خلیفہ اور بادشاہ کے دربار میں پھر اتنے بڑے امام سے دو دوست دشمن سب ہی

موجود ہو گئے۔ دہریہ بھی آیا مگر امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ وقت مقررہ سے بہت دیر کے بعد مجلس میں تشریف لائے۔ دہریہ نے پوچھا کہ آپ نے اتنی دیر کیوں لگائی آپ نے فرمایا کہ بھائی اتفاق سے آج جنگل کی طرف چلا گیا تھا۔ وہاں ایک عجیب واقعہ نظر آیا۔ جس کو دیکھ کر حیرت میں آکر وہیں کھڑا رہ گیا پوچھا کہ جناب وہ واقعہ کیا تھا۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے دیکھا کہ دریا کے کنارے پر ایک بڑا درخت کھڑا تھا دیکھتے ہی دیکھتے وہ درخت خود بخود کٹ کر زمین پر گر پڑا پھر خود بخود اس کے تنے تیار ہوئے پھر ان تختوں کی خود بخود ایک کشتی تیار ہو کر دریا میں جا پڑی جو ادھر کے مسافروں کو ادھر اور ادھر کے مسافروں کو ادھر لگانے لے جانے اور پار اتارنے لگی۔ ہر ایک شخص سے محصول بھی وصول کرتی تھی دہریہ نے یہ سن کر ایک قہقہہ لگایا اور کہا کہ آپ جیسا بزرگ اور امام ایسا جھوٹ بولتا ہے بھلا یہ کام کہیں خود بخود ہوسکتے ہیں جب تک کوئی کرنے والا نہ ہو کسی طرح نہیں ہوسکتے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا یہ تو کچھ بھی نہیں ہیں۔ آپ کے نزدیک تو اس سے بھی زیادہ بڑے بڑے عالی شان کام خود بخود بغیر کسی کرنے والے کے تیات ہوتے ہیں۔ یہ زمین یہ آسمان چاند یہ سورج یہ ستارے یہ باغات یہ سدہا قسم کے رنگین پھول اور شیریں پھل یہ پہاڑ یہ چوپائے یہ ساری خدائی بغیر بنانے والے کے تیار ہو گئی اگر ایک کشتی کا خود بخود بن جانا جھوٹ ہے تو سارے جہاں کا بغیر بنانے والے کے بن جانا اس سے بھی زیادہ جھوٹ ہے۔ دہریہ آپ کی یہ تقریر سن کر دم بخود ہو کر حیرت میں آیا۔ پھر تھوڑی دیر محو حیرت کے اپنے عقیدہ سے تائب ہو کر مسلمان ہوا۔

چوتھا مشاہدہ وحدانیت باری تعالیٰ:

روایت: حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا گیا کہ آپ نے جہان کے بنانے والے کا کس طرح پتہ لگایا۔ فرمایا کہ میں نے ایک دنم ایک سفید گنبد دیکھا جس میں کہیں راستہ نہ تھا

جس کا نہ در تھا نہ دروازہ ،نہ کوئی اندر جاسکتا تھا اور نہ اندر سے باہر آسکتا تھا میرے سامنے وہ گنبد خود بخود شق ہوا اور اس میں سے ایک حسین خوب صورت خوش الحان زندہ جانور کا بچہ نکلا جو کہ انڈے کے اندر ہی اپنے دوست دشمن کو پہچان سیکھ گیا تھا۔ جو بلی یا چیل وغیرہ جیسے دشمنوں کو دیکھ کر فوراً ماں کے پروں میں چھپنا جانتا تھا۔ دشمن کا پنجہ اور ماں کی شفقت کے پروں کو پہچانتا تھا جو پیدا ہوتے ہی ماں کے بلانے کی آواز سمجھتا تھا۔ جو جہان بھر میں اپنے کھانے کی چیزوں کو پہچانتا تھا۔ بغیر سکھائے کھانا پینا سارے کام خوب کرتا تھا۔ بتاؤ انڈے کے اندر کس نے اسے یہ کام تعلیم کیسے تھے جو انڈے کے بند گنبد میں بچہ کو تعلیم کرنے والا وہی خالق اور جہان کا بنانے والا ہے۔

(فتبرا ک اللہ احسن الخالقین)

پانچواں مشاہدہ وحدانیت باری تعالیٰ:

فراست: ایک عالم سے پوچھا کہ آپ نے خالق کو کس طرح پہچانا فرمایا کہ مجھے ایک کالی بھینس نے خدا کی ہستی کا پتہ بتایا۔ میں نے دیکھا کہ ایک کالا بے ڈول سا جسم ہو، نہایت بری صورت کا ایک جانور ہے جو بہت سا کوڑا گھاس پھونس کھا کر ساری رات میرے سامنے بیٹھا رہا۔ نہ وہ کہیں گیا اور نہ کوئی اس کے پاس آیا۔ صبح کو اس جانور نے سفید رنگ کا نہایت خوش ذائقہ خوشبودار بہت دودھ دیا جس میں سے بہت سا مکھن نکلا دودھ کے گرم کرنے کے لئے ایندھن بھی ساتھ ساتھ موجود ہوا، بظاہر وہ گوبر اور دودھ ایک ہی جگہ ایک ہی برتن سے نکلتا نظر آتا تھا مگر دودھ میں گوبر کا اثر اور گوبر میں دودھ کا نشان تک نہ تھا، ایک ہی برتن سے مخالف دو چیزوں کا نکلنا اور پھر ایک کا ایک سے الگ رہنا کیونکر ہوا۔ اس کوڑے سے کس مشین نے یہ دودھ کھینچ

کرنکالا۔ ضرور یہ کسی بڑے قدرت والے کاکام ہے۔ قرآن مجید اس مشین کے مالک کانام بتاتاہے۔

مِمَّا فِي بُطُونِهِ مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَدَمٍ لَبَنًا خَالِصًا سَائِغًا لِلشَّارِبِينَ (النحل ٦٦)

خدائے برحق فرماتاہے کہ ہم پلاتے ہیں تم کو جانور کے پیٹ سے خون اور گوبر کے درمیان سے خالص دودھ جو خوشگوار ہے، پینے والوں کے لئے۔

چھٹامشاہدہ وحدانیت باری تعالیٰ:

حکمت: حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم سے پوچھا کہ آپ نے خداکو کس طرح پہچانا۔ فرمایا: عرفتُ رَبّی بِفَسخِ العزائم۔ میں نے اپنے رب کو مضبوط ارادوں بڑے بڑے عاقلوں کے منصوبے ٹوٹ جانے کے سبب پہچاناکہ ضروران سب عاقلوں کے بالاترکوئی اورطاقت ہے جس کے سامنے سب عاجزہیں موجودہ زمانے میں اس اجمال کی تشریح یوں ہوسکتی ہے کہ جب ایڈورڈ ہفتم بادشاہ انگلستان وہندوستان کے پیٹ میں شدیدزخم ہوااوروہ زخم کسی طرح اچھانہ ہوابعض ڈاکٹروں کی رائے ہوئی کہ پیٹ میں شگاف دیاجائے بعض نے کہاکہ شگاف دینے کے بعد جان برہونامشکل ہے کل پرانجام ہیں اتفاق رائے اسی پرہواکہ ضرورمیں شگاف دے کرزخم صاف کیاجائے اورشگاف دینے کے وقت بعض تقدیر کے منکرڈاکٹروں نے بآوازِ بلندپکاراکہ آج تقدیراورتدبیر کامقابلہ ہے اورضرورتدبیرتقدیرپرغالب آئے گی۔ اتفاق سے وہ جراحی عمل موافق ہوا وہ علاج درست آیا۔ بادشاہ کوشفاہوئی پھرتوجوکچھ ان جراحوں نے نازکیااوربے جاکلمے منہ سے نکالے وہ واقفوں پرروشن ہیں لیکن اس تجربہ اورتدبیر کے تقدیرپرغالب آنے کے بعدجب بادشاہ کے مرنے کاوقت آیااور إِنَّ أَجَلَ اللَّهِ إِذَا

جَاءَ لَا يُؤَخَّرُ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ (نوح ۴) کا مطلب پوراہونے کو ہوا اس وقت وہ سارے تجربہ کارڈاکٹر جن کو اپنے علم پر بڑا ناز تھاجو اپنی تدبیر کو تقدیر پر غالب سمجھتے تھے جو اس سے پہلے جراحی عمل کرکے موت کو ٹال چکے تھے جو اپنے کام میں نہایت پختہ کار تھے۔ وہ سب کے سب وہاں کھڑے تھے اور بادشاہ اپنی جان خدا کے حوالے کررہاتھا۔ افسوس اس وقت سب کی تدبیریں غلط ہوئیں آخر تقدیر کا لکھاہوا تدبیر پر غالب آیا سارے منصوبے ٹوٹ گئے۔ اسی لئے حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم فرماتے ہیں کہ دنیا کے بڑے بڑے عقل مندوں کی تدبیریں ٹوٹ جانے سے مجھے معلوم ہوا کہ ان سب کے اوپر کوئی اور طاقت موجود ہے جو سب کو زیر کرتی ہے پس وہی زبردست خدا ہے۔

ساتواں مشاہدہ وحدانیت باری تعالیٰ:

تجربہ: زمانہ حال مین علمی تجربہ میں جس قدر بڑھتے گئے خدا کی ہستی کا اور بھی زیادہ ثبوت ملتا گیا۔ ایک اچھا زہریلا سانپ جس کو کاٹے وہی مرجائے مگر ایک سانپ کا دوسرے سانپ کو کاٹنا کوئی نئی بات پیدا نہ کرسکے۔ محققانہ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ ہر ایک سانپ کے منہ میں دو عظیم الشان خزانے ہیں ایک ستم قاتل اور دوسرا تریاق یہ دونوں باہم ضد ہیں لیکن بہت ہی پاس پاس یہ دو دشمن آباد ہیں جن کی پیدائش کی ایک ہی جگہ ہے ایک منہ ایک غذا سے پیدا ہوئے ہیں ان کے بیچ میں ایک باریک سا پردہ ہے جو ہر ایک خزانے کو الگ الگ رکھتا ہے۔ اول باریک آلات کے ذریعے سے وہ دونوں خزانے توڑ کر الگ الگ نکالے گئے پھر باریک سی پچکاری کے ذریعے پچکاری کے ذریعہ زہر کا خزانہ جو نہایت قلیل سی زہریلی رطوبت تھی ایک کتے کے بدن میں پہنچائی۔ تب فوراً ہی وہ کتا مر گیا پھر تریاق کی پچکاری دوسرے کتے کے لگائی اس کے بعد زہریلی پچکاری لگاکر دیکھا تو اب کوئی

اثر پیدا نہ ہوا۔ اس طرح زہر اور تریاق کے دو متضاد خزانے بہت ہی پاس پاس مل گئے۔ زہر کی حالت یہ ہے کہ کل کائنات زہر کے ایک قطرہ کا ساٹھواں حصہ رطوبت ہے مگر تاثیر میں دو تین بوند سنکھیا سے بھی زیادہ تیز ہے۔ اسی طرح تریاق کی حالت بھی ایسی ہے جس کی مقدار قطرہ کا آٹھواں حصہ بھی نہیں مگر تاثیرِ شفا میں منوں زہر مہرہ خطائی سے زیادہ ہے۔ کثیر المقدار تریاق افاعی سے اثر میں فاضل سے پھر اتنے قریب قریب اس طرح آگ پانی کا رکھنا اور ایک ہی مادہ سے ضدوں کا پیدا کرنا بڑی عقل پر موقوف ہے پھر وہ اس قابل ہے کہ خدائی کا تاج اس کا حصہ قرار دیا جائے اس کی حکمتیں وہی خوب جانتا ہے جو کچھ ہمیں بتا دیا وہ ہم بھی کہہ سکتے ہیں اگر اس زہر کے مقابل تریاق نہ ہوتا تو سانپ کی نسل دنیا میں نہ رہ سکتی ایک سانپ دوسرے کو کاٹ کر فوراً فنا کر دیتا اور سانپ کے منہ میں زہر بہت سے فائدوں کے لئے امانت رکھا گیا ہے۔ اگر ایک کالے سانپ کا زہر ایک بوند پانی میں حل کیا جائے پھر اس بوند سے ایک قطرہ دس بوند میں ملا کر حل کیا جاوے پھر اس دس بوند سے ایک قطرہ اس آفت رسیدہ کو پلایا جائے جو کہیں راہ راستہ میں دب کر رہ گیا ہو اور پھر بہت دیر کے بعد نکالا گیا برف کی ٹھنڈک سے جس کا تمام خون جم گیا۔ سانس آنا بند ہو کوئی دم کا مہمان ہو۔ علاج بالضد ہوتا ہو اگر برف والے مریض کو کوئی ایسی قوی دوا دی جائے کہ جس کے سبب بدن میں حرارت فوراً پھیل جائے تو یہ مریض ابھی اچھا ہو سکتا ہے ایسی کوئی دوا موجود نہ تھی بجز اس زہر کے جو مدبر کیا گیا ہے۔ پس اس کا ایک قطرہ پلاتے ہی فوراً سارے بدن میں گرمی ہی کے ساتھ روح پھیل جائے گی اور دوبارہ زندگی میسی ہو گی۔ خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (سورۃ البقرۃ: ۲۹) ترجمہ: وہی ہے جس نے تمہارے لیے بنایا جو کچھ زمین میں ہے۔

آٹھواں مشاہدہ وحدانیت باری تعالیٰ:

مسئلہ: اگر ہم سے کوئی پوچھے کہ تم نے خدا کی ہستی کو کس طرح جانا تو ہم اسے جواب دیں گے کہ ہم نے بڑے بڑے شہروں میں بڑی بڑی کپڑوں کی مشینیں دیکھی ہیں جن میں کوئی ریشمی کپڑا بنتی ہے۔ کوئی اونی کپڑا، کوئی سوتی جن میں سے ہم کو ایک ریشمی کپڑے کی مشین کی سیر کا اتفاق ہوا مشین کے ایک سرے پر الجھا ہوا ریشم ڈالا جاتا تھا اور دوسری طرف سے تیار ریشم تھان اٹھایا جاتا تھا اس کی صورت یہ تھی کہ کچھ پرزے تانا بانا ٹھیک کرتے۔ کچھ پرزے کپڑا بنتے کچھ پرزے پھول اور بیل بوٹے ڈالتے۔ کچھ پرزوں کے زریعہ مختلف رنگتیں ڈالی جاتی تھیں۔ جب تھان بن کر تیار ہوا تو کچھ پرزوں نے تھان کو تہہ کیا مارکہ (نشان) لگایا۔ ایک پرزہ نے تھان کو کاٹ کر کی دلیل ہے۔ یہاں بہت سے بیلیں ایسی بھی موجود ہیں کہ جن کا تعلق زمین سے کچھ بھی نہیں ہے وہ صرف ہوا سے اپنی پرورش کے اجزاء کو کھینچ کر اپنا کام کرتی ہیں پھر ان کی سبزی ان کے قسم قسم کے رنگیں پھول پھلوں کی خوشبوئیں ضرور قدرت کی بڑی یادگار ہے ہر زبان میں اس کی یاد یکساں ہوتی ہے۔

نواں مشاہدہ:

واقعہ: سلطان محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے جب ہندوستان کے کسی بڑے شہر کو فتح کیا شہر میں داخلہ کے وقت ایک برہمن جس کی عمر سو سال سے زیادہ تھی آپ کے سامنے لایا گیا۔ جو چپکے چپکے کہہ رہا تھا۔ بادشاہ نے پوچھا تو کیا پڑھتا ہے۔ برہمن نے کچھ کہا کہ جس کا ترجمہ یہ تھا۔

المخطوط المستقیم من المحیط الی المرکز مستاویة۔

یعنی گول دائرہ کا درمیانی نقطہ جس کے سہارے سے دائرہ کھینچا جاتا ہے جس کو مرکز بھی کہتے ہیں اس درمیانی نقطہ کی جانب گول حلقے سے جتنے خط سیدھے نکلیں گے وہ سب برابر ہوں گے ان میں کسی قسم کی کمی بیشی نہ ہوگی۔ یعنی جس طرح ہر خط کا دائرہ سے نکل کر درمیانی نکتہ تک پہنچنا یکساں ہے

اسی لیے علم نحو میں یہ قاعدہ پاس ہوچکا ہے کہ ہر غائب کی ضمیر سے پہلے اس کا مرجع مذکور ہونا چاہیے ورنہ اضمار قبل الذکر منع ہے لیکن اگر یہی غائب کی ضمیر ذات باری تعالیٰ کے لیے ہے تو اس کے لیے پہلے سے مرجع کا ذکر کرنا لازم نہیں کیونکہ اس کی ذات ہر جگہ ہر مکان میں موجود ہے۔ ہر دل میں ہر ایک زبان میں اس کا ذکر ہے۔ وہ سب جگہ حاضر ہے ہر شخص اسے خوب جانتا ہے۔ هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ (سورۃالحدید:۳) کا یہی مطلب ہے۔

دسواں مشاہدہ:

کسی بزرگ سے پوچھا کہ آپ کے نزدیک خدا کی قدرت کی بڑی نشانی کون سی چیز ہے۔ فرمایا کہ فرش زمین جس کو رات دن ہم پیروں س روندتے اپنی نجاستوں سے آلودہ کرتے ہیں جس کی شان میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَالْأَرْضَ فَرَشْنَاهَا فَنِعْمَ الْمَاهِدُونَ (سورۃالذاریات:۴۸)۔ ترجمہ: اور زمین کو ہم نے فرش کیا تو ہم کیا ہی اچھے بچھانے والے۔

زمین کے فرش میں متضاد اوصاف کا جمع کرنا محض اسی قدرت والے کا کام ہے آج اگر ہزار روپیہ فٹ کا قالین بنایا جائے اس میں بھی ایسے وصف جمع نہیں ہوسکتے نرمی اور سختی باہم دو متضاد صنعتیں کس خوبی سے زمین سے جمع کی گئی ہیں نرم اتنی کہ ایک خلال کے تنکے یا ناخن سے کھودنا شروع کردو، برابر کھدتی جائے گی سخت اتنی کہ بڑے سے بڑے قلعے ہزار محل ہزاروں پہاڑ اس نرم بستر پر رکھ دیجئے سب کو اپنی پشت پر اٹھالے گی۔ ایک تل کے برابر نیچے نہ دھنسے گی نہ دبے گی پتھر نہ پتھر کی طرح سخت ہے جس پر لیٹ کمر دکھ جائے گی نہ پانی کی طرح نرم ہے کہ پیر رکھتے ہی دب جائے وہ درمیانہ وصف عطا فرمایا کہ سبحان اللہ کہ صورت کالی مٹیلی ہے مگر باطن کتنا صاف اور پوشیدہ ہے پھولوں کی صفائی اور نزاکت زمین ہی کی صاف باطنی کا نتیجہ ہے تعجب کی بات ہے کہ اگر کوئی شخص

اپنے پانی کے مٹکوں میں سات دفعہ پانی چھان کر بھرے خواہ مٹکے سونے کے ہوں یا چاندی کے یا شیشے کے ہوں یا مٹی کے چوتھے پانچویں دن ضرور پانی خراب میلا اور گدلا ہو جائے گا۔پانی میں بو آنے لگے گی کیڑے پڑ جائیں گے مگر یہی پانی برسوں تک کنوئیں کی تہہ اور کالی کیچڑ میں کیسا موتی سا صاف شفاف اور ستھرا رہتا ہے نہ بدبو پیدا ہوتی ہے نہ کیڑے پڑتے ہیں بلکہ کالی کیچڑ میں پانی ایسا صاف رہتا ہے جیسے سیپ میں موتی محفوظ رہتا ہے سڑی اور کالی مٹی میں کسی نے آپ کے لیے پانی چھان کر رکھا ہے غور کا مقام ہے کہ سونے چاندی کے مٹکے میں چھنا ہوا پانی میلا ہو جائے گا مگر کنوئیں کی کیچڑ میں پانی صاف رہے معلوم ہوا کہ زمین کا باطن نہایت صاف ہے اور یہ سب کچھ اس خالق کی قدرت ہے اس بستر کی سخاوت کو دیکھئے کہ جب آپ کوڑا یا نجات کے ٹوکرے بھر بھر کر زمین پر ڈالیں گے یہ اپنے کرم سے آپ کو دوگنا میوہ غلہ رنگین اور خوشبودار پھول اور خوش ذائقہ پھل اس قدر عطا کرے گا کہ آپ سے لیے نہ جائیں گے نجاست لے کر پھول اور عطر دینا کوڑا لے کر میوہ جات عوض میں دینا اسی فرش زمین کا کام ہے ایک گٹھلی آم یا کھجور کی اس زمین کو دیجئے عظیم الشان درخت لیجئے۔پھر سالہا سال تک صدہا من شیریں آم یا کھجوریں لیے جائیے۔ایک مرتبہ کنواں کھودیئے ہزاروں برس تک پانی پیئے جائیے۔ ایک دانہ گیہوں کے عوض سو دانے دینا اس سخی فرش کا حوصلہ ہے۔یہ سب کچھ عطا اس پاک وبے نیاز کی ہے جس کی شان کا یہ مبارک فرش زمین سے پوری کر دیں کھانے کی جگہ کھانا میوہ کی جگہ میوہ لباس کی جگہ لباس زیور کی جگہ زیور جواہرات عطر کی جگہ عطر پھولوں کی جگہ پھول غرض جو کچھ پایا سب کچھ اسی زمین سے پایا گیا۔خوب فرمایا ہے۔

أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ كِفَاتًا أَحْيَاءً وَأَمْوَاتًا (سورۃالمرسلات:۲۶،۲۵)۔

ترجمہ: کیا ہم نے زمین کو جمع کرنے والی نہ کیا تمہارے زندوں اور مُردوں کی۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت اور جسم انسانی

جسم انسانی اور رحمت الٰہیہ:

خلیہ (CELL):

(۱) خلیہ زندہ اجسام کی بنیادی اکائی کا نام ہے جس طرح انسانی ہاتھوں سے بنی ہوئی عمارتیں اینٹوں اور پتھروں کا مجموعہ ہوتی ہیں اور اینٹیں یا پتھر عمارت کے بنیادی جزو یا اکائی کہلاتے ہیں اسی طرح انسان بھی خلیوں سے مل کر بنا ہے اور یہ خلیے انسان کی اکائی کہلاتے ہیں۔ ایک اوسط قدو قامت کے انسانی جسم میں ان خلیات کی تعداد ایک کروڑ ارب کے قریب ہے۔

(۲) خلیے زندگی کے مختلف افعال انجام دیتے ہیں۔ مثلاً یہ سانس لیتے ہیں، غذا حاصل کرتے ہیں اور بڑھتے ہیں اور وقت پورا ہونے پر اللہ کے حکم سے اپنا کام پورا کر کے ختم ہو جاتے ہیں۔

(۳) تمام اربوں کھربوں خلیے ایک ہی خلیے سے بنتے ہیں، کروڑوں خلیے روزانہ ختم ہو جاتے ہیں اور دوسرے خلیے اسی وقت ان کی جگہ لے لیتے ہیں، اندازہ ہے کہ ہر سیکنڈ میں خون کے ۱۰ لاکھ سے زیادہ خلیات ختم ہو جاتے ہیں اور اسی تعداد میں نئے خلیات جنم لے لیتے ہیں۔

(۴) ہر خلیہ میں ۷۰ سے ۸۵ فیصد تک پانی ہوتا ہے۔

(۵) خلیہ کا ایک اہم جزو مائٹو کنڈریا (Mitochondria) ہے جو خلیہ کا پاور ہاؤس ہے، اس کے بغیر خلیے زندہ نہیں رہ سکتے۔

(٦) ہر خلیہ کی بیرونی دیوار دو تہہ کی ہوتی ہے اس میں پانی اور پانی میں حل پذیر اشیاء نہیں گزر سکتیں، البتہ چربی میں حل پذیر اشیاء گزر سکتی ہیں۔

(۷)خلیہ میں پانی کے علاوہ ۱۰ سے ۲۰ فیصد لحمیات ہوتے ہیں۔ ۲ فیصد کولیسٹرول اور فاسفور لپڑ(چربی، چکنائی)ہوتے ہیں، ایک فیصد نشاستہ دار اجزاء ہوتے ہیں۔

(۸)جینز(Genes)خلیے کے تمام افعال کو کنٹرول کرتے ہیں۔

ہڈیاں(BONES):

(۱)ہڈیوں کا وجود ایک نعمت ہے۔

(۲) جسم انسانی میں ہڈیاں مختلف ہوتی ہیں ۔ مثلاً ٹیڑھی، سیدھی، گول، مستطیل، ٹھوس، چوڑی، پتلی، ہلکی، بھاری اور خول دار وغیرہ، ہڈیاں انسان کو حرکت کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ ذرا سوچیے اگر تمام جسم میں ایک ہی سالم ہڈی ہوتی تو انسان کے لیے چلنا، پھرنا، جھکنا وغیرہ دشوار ہو جاتا۔

(۳)ایک ہڈی کو دوسری ہڈی سے ملانے کے لیے ان کے کناروں کو اس طرح بنایا کہ اگر ایک مکعب ہے تو دوسری ہڈی کا کنارہ مجوف ہے تاکہ دونوں آسانی سے باہم پیوست ہو سکیں۔

(۴)ہر ایک ہڈی کی خلقت ہی عجیب ہے، پھر کسی کی شکل وصورت دوسرے سے نہیں ملتی اور اس انداز سے ان کو رکھا ہے کہ اگر ان میں ایک کی تعداد بڑھادی جائے تو بھی وبال جان ہو جائے اسی طرح اگر ایک کو گھٹا دیا جائے تو اس کو پورا کرنے کی سخت ضرورت محسوس ہو۔

(۵)خون میں جو سرخ ذرات ہوتے ہیں وہ ہڈیوں کی بدولت پیدا ہوتے ہیں۔

(۶)ہڈیاں جسم کے تمام تقاضوں کے لیے ڈھانچہ مہیا کرتی ہیں۔

(۷)ہڈیاں جسم کے اہم ترین اعضا کی حفاظت کرتی ہیں۔ مثلاً دل، دماغ، پھیپھڑے وغیرہ۔

(۸)ہڈیاں کیلشیم(CALCIUM)کا ذخیرہ بناتی ہیں۔

(۹) امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہڈیوں کی حرکات کے لیے پورے جسم میں 539 عضلات پیدا کیے۔

(۱۰) بچوں میں ہڈی کم ٹوٹتی ہے اکثر مڑ جاتی ہے اور جلد جڑ بھی جاتی ہے وجہ یہ ہوتی ہے کہ بچوں کی ہڈی میں نامیاتی مادہ زیادہ ہوتا ہے۔(کتاب الابدان)۔

(۱۱) اگر ہڈی کسی وجہ سے ٹوٹ جائے تو جب ٹھیک ہوتی ہے تو پھر وہاں سے دوبارہ نہیں ٹوٹ سکتی۔

(۱۲) ریڑھ کی ہڈی تمام جسم کے بمنزلہ ستون کے ہے۔ ہاتھ پاؤں اس کے ساتھ لگے ہوتے ہیں تمام دھڑ اس پر قائم ہوتا ہے، اس میں اک عمودی سراخ ہوتا ہے جس میں دماغ کا وزیر حرام مغز محفوظ ہوتا ہے۔(کتاب الصحت)۔

مفاصل۔(جوڑ)(JOINTS):

(۱) جس جگہ ہڈیاں آپس میں ایک دوسرے سے جڑی ہوتی ہیں ان مقامات کو جوڑ یا مفاصل کہتے ہیں، ان جوڑوں کا وجود ہی ایک نعمت ہے۔

(۲) جوڑوں کا صحیح سالم ہونا یہ دوسری نعمت ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے ہمارے جسم میں ایک سو اسی (۱۸۰) جوڑ بنائے ہیں جو ہمارے جسم کو حرکت دیتے ہیں۔(کتاب الصحت)

(۴) قدرت نے جوڑوں کے اندر سفید رقیق مادہ رکھا ہوتا ہے جو ان کی حفاظت کرتا ہے اور ان کو قوت پہنچاتا ہے۔

عضلات (مسل)(MUCLES):

جسم کے تمام حصوں میں جلد کے نیچے گوشت کی جو تہیں پائی جاتی ہیں۔ وہ عضلات کہتے ہیں۔

بقول امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے انسانی جسم میں پائے جانے والے عضلات کی تعداد ۵۲۹ ہے۔

(۱)عضلات اندرونی اعضا کو گرمی اور سردی سے محفوظ رکھتے ہیں۔

(۲)عضلات ہڈیوں اور جوڑوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

(۳) جسم کو خوبصورت اور سڈول بناتے ہیں۔

(۴)عضلات جسم میں حرکت پیدا کرتے ہیں۔ چلنا، پھرنا، اٹھنا، بیٹھنا، کھانا، پینا، ہنسنا، بولنا وغیرہ انہی کی بدولت عمل میں آتا ہے۔

(۵)عضلات فضلہ مادہ (پیشاب، پاخانہ) کو ہر وقت نکلنے اور بہنے سے بچاتے ہیں ورنہ انسان کا میل جول بہت دشوار ہوتا ہے۔

(۶) مذکورہ ان تمام نعمتوں کا وجود چونکہ عضلات ہی کی بدولت ہے اس لیے عضلات کا اپنا وضو دخود ایک علیحدہ مستقل نعمت ہے۔

(۷)عضلات کا وجود ایک نعمت ہے۔

(۸)بغیر درخواست کے ان کا صحیح رہنا بھی نعمت ہے۔

اعصاب (پٹھے)(NERVES):

رگوں کی امنند جسم انسانی میں سفید رنگ کی نہایت باریک، باریک تاروں کا ایک جال ہوتا ہے۔ یہ تاریخ بتدریج آپس میں ملتی ہوئی گول یا چپٹی ڈوریاں سی بناتی ہوئی دماغ یا حرام مغز میں جاکر ختم ہوجاتی ہیں، انہی کو پٹھے یا اعصاب کہا جاتا ہے۔

(۱)نظام عصبی کا بڑا مرکز دماغ ہے اور اسی کا ایک حصہ حرام مغز ہے۔ دماغ کھوپڑی کے اندر محفوظ رہتا ہے اور حرام مغز ریڑھ کی ہڈیوں سے بنے ہوئے قلعے میں محفوظ رہتا ہے۔

(۲) جسم کے تمام افعال حسن وحرکت انہی سے متعلق ہیں۔ چنانچہ ایک قدم اٹھانے میں یا ایک یا آدھے سیکنڈ ۵۴ پٹھے استعمال ہوتے ہیں۔

(۳)اعصاب ہڈیوں کو باہم ملانے اور جوڑوں کو ایک دوسرے سے وابستہ رکھنے کام بھی آتے ہیں۔

(۴)اعصاب میں دوڑنے والی روکی رفتار ۴ میل فی سیکنڈ ہے۔یعنی ایک گھنٹے میں ۴ ہزار ۴ سو میل فاصلہ طے کرتی ہے۔ دماغ سے جو پیغام انگلی تک پہنچتا ہے وہ ایک سیکنڈ کو سوویں حصے میں اپنا فاصلہ طے کرلیتا ہے۔

(۵)اعصاب کا ہونا بھی ایک نعمت ہے۔

(۶)بغیر طلب کے صحیح سالم ہانا اور اپنا کام کرنا بھی ایک نعمت ہے۔

کولہے(BUTTOCK):

(۱)کولہے کا ہونا ایک نعمت ہے۔

(۲)درست ہونا دوسری نعمت ہے۔

(۳)کولہے کی بدولت بیٹھنے میں آسانی ہونا بھی نعمت ہے۔

(۴)ہڈی نہ ہونا۔

(۵)فضلہ کا راستہ ہونا۔

(۶)گوشت کا نرم ہونا۔

(۷)بیٹھنے کی صورت میں وزن برداشت کر سکنا۔

(۸)بغیر درخواست کیے ان کا صحیح رہنا بھی نعمت ہے۔

(۹)دونوں کولہوں کا برابر ہونا اور بڑا چھوٹا نہ ہونا۔

(۱۰) مسل (Muscle) کا ہونا (جس کی قوت سے پاخانہ روکا جاتا ہے)۔

جلد (کھال)(SKIN):

(۱)جلد کا وجود ایک نعمت ہے۔

(۲)جلد کا صحیح سالم ہونا بھی بڑی نعمت ہے اس لیے کہ اگر کہیں سے جلد پھٹ جائے تو ہزاروں جراثیم بیک وقت جلد کے راستے جسم میں گھسنے کی کوشش کرتے ہیں۔

(۳) حق تعالیٰ نے جلد کو ہماری خوبصورتی کا ذریعہ بنایا ہے۔ذرا سوچئے کہ اگر جلد نہ ہوتی تو ہماری صورت کس قدر خوفناک وہیبت ناک ہوتی۔

(۴)جلد ہمیں بیرونی آلائشوں سے بچاتی ہے۔

(۵) جلد میں دولاکھ پچاس ہزار سے زائد ایسے خانے ہیں جو سرد چیزوں کو محسوس کرتے ہیں، جب کوئی سرد چیز جسم کو چھوتی ہے تو دماغ کو خبر پہنچ جاتی ہے اور جسم کانپنے لگتا ہے، جلد کی نالیاں کشادہ ہو جاتی ہیں اور مزید خون جلد کو جانے لگتا ہے تاکہ زیادہ گرمی پہنچائی جائے۔

(۶) جلد کو جب گرمی پہنچتی ہے تو گرمی کے مخبر خلیے دماغ کو خبر کرتے ہیں اور تین ملین پسینہ کے غدود ٹھنڈا پسینہ خارج کرتے ہیں جسم سے جسم کو راحت وسکون پہنچتا ہے۔گویا کہ ہماری جلد میں حیاتی ریشوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے جو گرم وسرد چیزوں کو محسوس کرتا ہے اور دماغ تک خبر پہنچا دیتا ہے۔

بال(HAIR):

(۱)بالوں کا ہونا نعمت ہے۔

(۲)بالوں کا درست ہونا نعمت ہے۔

(۳)بالوں کا مناسب ہونا نعمت ہے۔

(۴)بالوں کا سیاہ ہونا نعمت ہے۔

(۵)تعداد میں ہزاروں بالوں کا ہونا۔

(۶)بالوں کا دیر سے سفید ہونا۔

(۷)بالوں میں کاٹنے میں سہولت کا ہونا۔

(۸)بالوں کا مکرر نکل آنا۔

(۹)سر کے بالوں کی وجہ سے حسن کا ہونا۔

(۱۰)سر کے بالوں کا دماغ کی حفاظت کرنا۔

(۱۱)سر کے بالوں کی وجہ سے اور سہولت کے لیے مسح کا حکم دیا جانا۔

(۱۲)بالوں کی وجہ سے مانگ نکال سکنا۔

(۱۳)حقوق (تیل، کنگھی وغیرہ)ادا کر کے بالوں کا صاف رکھ سکنا۔

(۱۴)بغیر طلب کے باقی رہنا۔

(۱۵)بغیر طلب کے ملنا۔

(۱۶)بغیر طلب کے باقی رہنا(مکرررررررررر)۱۴نمبر میں بھی یہی ہے۔

(۱۷)بغیر خواہش کے بالوں کا بڑھنا۔

(۱۸)مردوں کے چہرہ پر داڑھی کا باعث زینت ہونا۔

(۱۹)داڑھی کا مردوں اور عورتوں میں تمیز کرنا۔

(۲۰)داڑھی باعث شرافت ہے۔

(۲۱)داڑھی گناہوں کو بارعب بناتی ہے۔

(۲۲)ہاتھ کی ہتھیلی پر بالوں کا نہ ہونا بھی نعمت سے کم نہیں اس لیے کہ اگر ہتھیلی پر بال ہوتے تو کام کرنے میں سخت وقت پیش آتی اور چیزوں کو چھونے کا طلب ختم ہو جاتا۔

(۲۳)شرم گاہ کے اندر بالوں نہ ہونا کیونکہ اگر شرم گاہ کے اندر بال نکل آتے تو جماع کی لذت کھو دیتے۔

ہاتھ(HAND):

(۱)ہاتھ کا ہونا نعمت ہے۔

(۲)ہاتھ کا درست ہونا نعمت ہے۔

(۳)برابر ہونا بھی نعمت ہے۔

(۴)انگلیوں کا ہونا نعمت ہے۔

(۵)جوڑوں کا ہونا۔

(۶)ہاتھوں کی ہیئت اور صورت بھی عجیب ہے، اس میں ہتھیلی اور پانچ انگلیاں ہیں اور انگلیوں میں پورے بنائے، چار انگلیاں ایک سمت میں رکھیں اور پانچواں انگوٹھا دوسری طرف کو رکھا تا کہ تمام انگلیوں کی طرف حرکت کر سکے۔

(۷)لکھ سکنا۔

(۸)کما سکنا۔

(۹)ہاتھوں میں انگلیاں نرم رکھیں اور ناخن سخت رکھے تا کہ ان سے کھجایا جاسکے۔

(۱۰)قدرت نے ہاتھوں میں جلب منفعت اور دفع مضرت کی صلاحیت رکھی ہے۔ ہاتھوں سے آپ نفع بھی اٹھاسکتے ہیں۔ مثلاً ہاتھ سے چلو کی شکل بنا کر پیالے کا کام لیا جاسکتا ہے۔ چمچے کا کام بھی لے سکتے ہیں، جھاڑو کے کام بھی آسکتا ہے۔ کسی بھی چیز کو پکڑ سکتے ہیں اور کسی چیز کو درست کرسکتے ہیں اور نقصان دِہ چیز کو ہاتھ کے ذریعے دور کیا جاسکتا ہے۔ جیسے مٹھی بند کرکے مکہ بناسکنا،

(۱۱) کھانا کھاسکنا۔

(۱۲)استنجا کرسکنا۔

(۱۳)کسی چیز کو صاف کرسکنا۔

(۱۴)ہر قسم کا اشارہ کرسکنا۔

(۱۵)مصافحہ کرکے گناہ جھاڑ سکنا۔

(۱۶)بغیر مانگے ہاتھوں کی عجیب پیدائش ہونا۔

(۱۷)ہاتھوں میں لکیریں ہونا۔

(۱۸)انگلیوں کی زینت کے لیے قدرت نے ہمیں ناخنوں کا عظیم تحفہ عنایت کیا۔

(۱۹)بغیر تکلیف کے ناخن کاٹ سکنا۔

(۲۰)ہاتھوں کے فضلہ کا ناخن کے ذریعے نکل سکنا۔

(۲۱)تسبیحات کرسکنا۔

(۲۲)ہاتھوں میں نرمی کا ہونا۔

(۲۳)خوبصورت ہونا۔

(۲۴)انگلیاں کھلنا اور بند ہونا۔

(۲۵) ہتھیلی کے اندرونی حصہ کا گہرا ہونا۔

(۲۶)ہاتھ کی پشت کی کلائی (بازو) کی شکل ورنگ میں ہونا۔

(۲۷) مٹھی بن سکنا۔

(۲۸)ستر میں نہ ہونا۔

(۲۹)ہاتھ (مع بازو) لمبا کر کے نکال سکنا۔

(۳۰)دوسرے کی حفاظت کر سکنا۔

(۳۱)محتاج نہ ہونا۔

(۳۲) ہتھیلی کی جلد کا سخت ہونا۔

(۳۳)بچوں کی پرورش کر سکنا۔

(۳۴)دوسرے کی خدمت کر سکنا۔

(۳۵)دین کا کام (زیادہ سے زیادہ) کر سکنا۔

(۳۶)دعا مانگ سکنا۔

فائدہ: ایک محتاط اندازے کے مطابق ہم اپنی کل عمر میں ہاتھ کو ۲۵ ملین بار کھولتے اور بند کرتے ہیں۔

پاؤں(FOOT):

(۱)پاؤں کا ہونا نعمت ہے۔

(۲)درست ہونا دوسری نعمت ہے۔

(۳)برابر ہونا بھی نعمت ہے۔

(۴)اوپر سے سخت اور نیچے سے نرم ہونا۔

(۵)پاؤں کا رنگ پنڈلی جیسا اور تلوے کا رنگ سفید ہونا۔

(۶) تلوے کی کھال کا سخت ہونا۔

(۷)ایڑھیوں کا سخت ہونا۔

(۸)پاؤں کی زینت کے لیے انگلیوں کا ہونا۔

(۹)انگلیوں میں جوڑ ہونا۔

(۱۰)پاؤں کی زینت کے لیے ناخنوں کا ہونا۔

(۱۱)پورے بدن کا وزن برداشت کر سکنا،ہمارے پاؤں میں قدرت نے اتنی طاقت اور توانائی رکھی ہے کہ وہ صبح سے رات تک چلتے رہتے ہیں مگر تھکتے نہیں اور اگر تھک بھی جائیں تو ذرا سے آرام کے بعد پھر تازہ دم ہو جاتے ہیں۔

(۱۲)انگلیوں کا کھلنا اور بند ہو سکنا۔

(۱۳)بغیر مطالبہ کے پاؤں کا عطا کیا جاتا۔

(۱۴)چل سکنا اور بوقت ضرورت دوڑ سکنا۔

(۱۵)پاؤں کی تمام اشیاء کا صحیح رہنا۔

(۱۶)فضلہ کا بذریعہ ناخن کے نکل سکنا۔

(۱۷)نیکی کے کام کی طرف چل کر جانا۔

ناخن(NAIL):

(۱)ناخنوں کا ہونا نعمت ہے۔

(۲)ناخنوں کا بغیر مطالبہ کے ملنا بھی نعمت ہے۔

(۳)ناخنوں سے انگلیوں کی زینت ہے۔

(۴)ناخن سخت رکھے تاکہ کھجلی کے کام آسکیں۔

(۵)ناخنوں کی مدد سے ہم بہت سی باریک باریک اور چھوٹی سے چھوٹی چیز کو چن سکتے ہیں۔

(۶)قدرت نے ناخنوں کو نہ ہڈی کی طرح سخت بنایا نہ گوشت کی طرح نرم۔

(۷)ناخن ٹوٹنے پر دوبارہ نکل آتے ہیں۔

(۸)ناخن اگر زیادہ بڑھ جائیں تو تراش دیئے جاتے ہیں۔

(۹)ہاتھ اور پاؤں کا فضلہ ناخن سے نکل جاتا ہے۔

بازو(ARM):

(۱)بازوؤں کا ہونا نعمت ہے۔

(۲)درست ہونا بھی نعمت ہے۔

(۳)برابر ہونا بھی نعمت ہے۔

(۴)مناسب الخلقت ہونا۔

(۵)ستر میں داخل نہ ہونا۔

(۶)کہنی کا ہونا۔

(۷)مڑ جانا بھی نعمت ہے۔

(۸)ہڈی اور گوشت کا مناسب بڑھنا۔

(۹)علاج معالجہ کے لیے پچھنے (ٹیکے) لگ سکنا۔

(۱۰)بغیر طلب کے ملنا اور صحیح باقی رہنا۔

(۱۱)اوپر نیچے گھوم سکنا۔

پنڈلی(CALF):

(۱)پنڈلی کا وجود ایک نعمت ہے۔

(۲)پنڈلی کا درست ہونا بھی نعمت ہے۔

(۳)اوپر سے نیچے کی طرف چھوٹا ہوتے آنا۔

(۴)انسانی قد کی خوبصورتی بڑھانا۔

(۵)ایک طرف ہڈی ایک طرف مچھلی کا ہونا۔

(۶)بغیر مانگے پنڈلی کا ٹھیک رہنا اور کام کرتے رہنا۔

گھٹنا(KNEE):

(۱)گھٹنا کا ہونا بھی نعمت ہے۔

(۲)درست ہونا بھی نعمت ہے۔

(۳)جوڑ ہونا بھی نعمت ہے۔

(۴)گھٹنا کی بدولت بیٹھ سکنا۔

(۵)بار بار اٹھنے بیٹھنے سے خراب نہ ہونا۔

(۶)بن مانگے درست رہنا۔

(۷)گھٹنے میں ہر وقت پانی کا موجود رہنا جو گریس(Grease) کا کام دیتا ہے۔

ٹخنہ(ANKLE):

(۱)ٹخنے کا ہونا نعمت ہے۔

(۲)درست ہونا بھی نعمت ہے۔

(۳)پنڈلی اور پاؤں کے درمیاں ہونا۔

(۴)ہر پاؤں میں دونوں طرف سخت ہڈی بن کر ابھرا ہوا ہونا۔

(۵)مردوں کے لیے ننگے ہونا اور عورتوں کے لیے ڈھکے ہونا ہی نعمت ہے۔

(۶)دونوں کا برابر ہونا۔

کندھا(SHOULDER):

(۱)کندھے کا ہونا نعمت ہے۔

(۲)درست ہونا بھی نعمت ہے۔

(۳)مناسب الخلقت ہونا۔

(۴)عمدہ خوبصورت لگنا۔

(۵)حرکت دے سکنا۔

(۶)طاقت ورعب کا مظہر ہونا۔

(۷)بن مانگے صحیح کام کرتے رہنا۔

سینہ(CHEST):

(۱)سینہ کا ہونا نعمت ہے۔

(۲)درست ہونا عیب دار نہ ہونا بھی نعمت ہے۔

(۳)بناوٹی لحاظ سے خوبصورت ہونا۔

(۴)چھاتی کا ہونا۔

(۵)مرد و عورت کی چھاتیوں(Mammary Gland)کا ان کے مناسب ہونا۔

(۶)ماں کی چھاتیوں میں دودھ کے چشموں کا پھوٹنا۔

(۷)چھاتیوں سے دودھ کا نکلنا اور بچہ کا دودھ سے سیر ہو جانا۔

(۸)بچہ کا دو سال سے بڑا ہونے پر یا دودھ چھڑانے پر دودھ کا بند ہو جانا۔

(۹)مرد کی چھاتی کا پردہ میں داخل نہ ہونا۔

(۱۰)غلبہ حیاء کی بناء پر عورت کی چھاتیوں کا ستر میں داخل ہونا۔

(۱۱)بغیر طلب کے عطا ہونا اور درست رہنا۔

کمر(BACK):

(۱)کمر کا ہونا نعمت ہے۔

(۲)کمر کا درست ہونا بھی نعمت ہے۔

(۳)سیدھا ہونا بھی نعمت ہے۔

(۴)اس میں مرکزی ہڈی کا ہونا۔

(۵)قد کے موزوں ہونا۔

(۶)جھک سکنا بھی نعمت ہے۔

(۷)ہر وقت تکلیف نہ ہونا۔

(۸)بن مانگے درست رہنا۔

(۹)لیٹنے میں دشواری نہ ہونا۔

دماغ(BRAIN):

(۱)دماغ کا وجود ایک نعمت ہے۔

(۲)دماغ جیسے کمپیوٹر کا بغیر مطالبہ کے مل جانا بھی نعمت ہے۔

(۳)اللہ تعالیٰ نے دماغ کی حفاظت کا بہترین انتظام کیا کہ ہڈیوں کے خول میں اس کو رکھا۔

(۴)دماغ ہمارے تمام خیالات وجذبات کا سرچشمہ وخزانہ ہے۔

(۵)دماغ تمام احساسات، ادراکات وحرکات کا منبع ہے۔

(۶)نئی ایجادات واختراعات تمام کی تمام دماغ ہی کی مرہون منت ہیں۔

(۷)اللہ تعالیٰ نے یاداشت کو باقی رکھنے کے لیے دماغ کو قوت عطافرمائی۔

(۸)انسانی دماغ کو مربوط بنایا دنیا کا بڑے سے بڑا کمپیوٹر بھی اس کے مقابلے میں عاجز آجائے۔

(۹)ہمارا دماغ ایک ملین سے بھی زیادہ مخصوص خلیوں سے بنا ہے جن کو نیوران کہا جاتا ہے۔

(۱۰)دماغ کے خلیے اپنا مخصوص کا ایک کھرب سے زائد احساس ریشوں کے ذریعے کرتے ہیں ،جو دماغ سے لے کر تمام جسم میں پھیلے ہوتے ہیں۔

(۱۱)دماغ کا اپنے اندر لاکھوں محفوظ شکلوں کے ساتھ موازنہ کرکے واقف اور ناواقف شخص کے متعلق ہمیں اپنے فیصلے سے آگاہ کردینا۔

(۱۲)اچھے اور برے میں تمیز دماغ کی مدد سے ہوتی ہے۔

(۱۳)دماغ ہی اعصاب اور اعضاء کو خون لینے یا روکنے کا حکم صادر کرتا ہے۔

(۱۴)زخم کی تکلیف جب دماغ کو پہنچائی جاتی ہے تو دماغ فوراً علاج کا حکم صادر کرتا ہے۔

(۱۵)دماغ کی ریلیں ایسی بنائی ہیں کہ ساری زندگی چلتی رہتی ہیں ختم نہیں ہوتیں۔

(۱۶)دماغ محل عقل ہے اور عقل ایسی نعمت ہے اگر خدانخواستہ یہ نہ ہو تو آدمی اور جانور کے درمیان فرق کرنا ممکن نہ رہے۔

(۱۷)عزت اسی عقل سے وابستہ ہے ورنہ لوگ پاگل شمار کریں گے۔

(۱۸)دنیااور آخرت میں مرتبہ انسان عقل ہی کے ذریعہ حاصل کرتا ہے۔

(۱۹)بغیر مطالبہ و کوشش کے عقل کامل جانا بھی ایک نعمت ہے۔

(۲۰)دماغ کے خلیوں کی تعداد ۲۵۰ کھرب ہے۔

آنکھ(EYE):

(۱)آنکھ کاہونا نعمت ہے۔

(۲)مناسب الخلقت ہونادوسری نعمت ہے۔

(۳)دونوں آنکھوں کابرابر ہونا مستقل نعمت ہے۔

(۴)نظر آناعلیحدہ نعمت ہے۔

(۵)خوبصورت ہونا بھی نعمت ہے۔

(۶)خاطر خواہ دیکھ سکنا۔

(۷)محدود دیکھ سکنا۔

(۸)حدیث شریف کے مطابق سات فرشتوں کاہر وقت آنکھوں کی حفاظت کرتے رہنا۔

(۹)پلکوں کاہونا بھی نعمت ہے،ان کے ذریعے آنکھ اور چہرہ کی خوبصورتی ہوتی ہے۔

(۱۰)اللہ تعالیٰ نے آنکھ کی حفاظت کے لیے اس کے اطراف میں پلکوں کو پیدا کیا، یہ پلکیں ادنیٰ سی چیز کو بھی اپنی طرف آتا دیکھ کر حرکت میں آجاتی ہیں اور پیش آمد خطرے سے آنکھوں کو آگاہ کر دیتی ہیں۔

(۱۱)پلکوں کے بڑھنے کی رفتار کو اللہ تعالیٰ نے ایک انداز سے تخلیق کیا ہے اگر یہ بال سر کے بالوں کی رفتار سے بڑھیں تو نعمت کی بجائے زحمت بن جائیں اور حسن وجمال کے بجائے بدصورتی کا سبب بن جائیں۔

(۱۲)آنکھ کی حفاظت کرنے کے لیے بالائی وزیریں دوپپوٹے بھی رکھے۔

(۱۳)آنکھ کی حفاظت کی خاطر اللہ نے اس کے چاروں طرف سخت ہڈی کا غلاف بنایا، منہ کے بل گرے یا سامنے سے کوئی چیز لگے تو آنکھ محفوظ رہتی ہے۔

(۱۴)چہرہ کی خوبصورتی کو دوبالا کرنے کے لیے آنکھ پر ابرو پیدا کی گئیں اور ان سے بھی آنکھوں کے بچاؤں کا کام لیا گیا اور ان کے بالوں کو بھی ضرورت سے زیادہ درازی نہیں ملی کہ بدرونقی پیدا ہو۔

(۱۵)آنکھ سے قریب اور درد کے مناظر یکساں دکھائی دینا۔

(۱۶)بصارت میں کمزوری کا ذریعہ عینک یا لینز کے دور ہو جانا۔

(۱۷) نفع ونقصان جان سکنا۔

(۱۸)بن مانگے آنکھوں کا صحیح رہنا۔

(۱۹)نگاہ کا ٹک جانا بھی نعمت ہے کہ جہاں بھی نظر دوڑائیں نگاہ ٹک جاتی ہے، کوئی چیز حد سے زیادہ چمک دار نہ بنائی جس پر نگاہی نہ ٹک سکے۔

(۲۰)اگرچہ ہم دونوں آنکھوں سے علیحدہ علیحدہ دیکھتے ہیں مگر پھر بھی ایک چیز ایک ہی نظر آتی ہے دونوں۔

(۲۱)آنکھ میں ایک خاص قسم کا دباؤ ہوتا ہے جس کی کمی وزیادتی آنکھوں کی غذائیت اور صحت پر اثر پذیر ہوتی ہے۔

(۲۲)آنکھ کے اندر ہر وقت کئی قوتیں ایسے کام میں لگی رہتی ہیں جس سے آنکھوں کی صحت پر اچھا اثر ہوتا ہے اور ان کی صحت بر قرار رہتی ہے۔

(۲۳)آنکھ کی مختلف رطوبات کے ذریعہ سامنے والی سطح خشکی سے بچی رہتی ہے۔

(۲۴)آنکھوں کو مختلف سمتوں میں پھیرنے کی قوت کا عطا ہونا بھی نعمت ہے۔

(۲۵)دائرہ نظر دائیں اور بائیں جانب اس قدر وسیع ہے کہ مختلف قسم کے خطرات سے بچ سکتے ہیں۔

(۲۶)رنگوں میں تیز بھی نظر کے ذریعے ہوتی ہے۔

(۲۷)آنکھ کا گول ہونا بھی نعمت ہے،اس کی گولائی کی وجہ سے ہماری نظر بہت بہتر ہے۔اگر یہ گول نہ ہوتی تو ہماری نظر اتنی صاف بہتر اور وسیع نہ ہوتی۔

(۲۸)دو تہوں کے علاوہ پوری کی پوری آنکھ شیشے سے بھی زیادہ شفاف ہے۔

(۲۹)ان کو شفاف رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بہت سے کارخانے آنکھ میں لگا رکھے ہیں۔

(۳۰)آنکھ کو غذا خون سے ملتی ہے مگر جو خون آنکھ میں جاتا ہے وہ اس خون سے مختلف ہے جو دوسرے اعضا کو پہنچتا ہے۔

(۳۱) آنکھ کے شفاف پردوں کی غذائیت کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایسے کارخانے لگا رہے ہیں کہ اگر ان کی پرورش خون سے ہوتی ہے مگر ان میں خون کہیں بھی نہیں۔

(۳۲) اسی لیے ہمیں نظر میں خود کی سرخی نہیں دکھتی بلکہ ہر چیز کی ساخت صحیح اور رنگ ٹھیک ٹھیک نظر آتا ہے۔

(۳۳) آنکھ کے اندر جراثیم داخل نہیں ہوسکتے اس کے لیے مدافعت کا ایک الگ نظام ہے۔

(۳۴) بہت زیادہ جراثیم معمولی رطوبتوں سے ختم کر دیئے جاتے ہیں۔

(۳۵) آنکھ کو چوٹ اور بیماریوں سے بچانے کے لیے بہت سے نظام کام کر رہے ہیں۔

(۳۶) آنسوؤں کو پیدا کیا جو آنکھ کے اندر میل کچیل کو باہر نکالتے ہیں۔

(۳۷) آنکھوں کے اطراف کے حصے درمیانی حصہ کی نسبت قدرے پست رکھے گئے تاکہ اگر کوئی چیز آنکھ میں پڑے تو اطراف کی طرف سے آسانی سے نکل سکے۔

(۳۸) ایک آنکھ میں ۱۳ کروڑ کیمرے کام کر رہے ہیں۔ جس میں سے ۶۰ لاکھ کیمرے صرف رنگ پہچانتے ہیں، بارہ کرورڑ کیمرے صرف کالا اور سفید رنگ بتاتے ہیں۔ رات کے وقت کام کرنے والے علیحدہ کیمرے ہیں جن کو رازڈر کہتے ہیں۔ جن لوگوں میں راڈز نہیں ہوتے ان کو رات کو نظر نہیں آتا۔

(۳۹) آنکھ اللہ تعالیٰ کی عجیب نعمت ہے اس کے بغیر انسان دوسروں کا محتاج ہو جاتا ہے۔

(۴۰) انسانی آنکھ میں ایک کھرب سے زائد روشنی قبول کرنے والے ریشے ہوتے ہیں۔ یہ تعداد ان ستاروں کے برابر ہے جو ”ملکی وے“ نامی کہکشاں میں ہیں۔

(۴۱) آنکھ کے آخری طبقے میں ۳۰ لاکھ تہیں اور ۳ کروڑ ستون ہیں۔

(۴۲)ہماری آنکھیں ایک سال میں کم از کم چالیس لاکھ دفعہ کھلتی اور بند ہوتی ہیں۔

(۴۳) آنکھ کے نور کے علاوہ باہر کی معمولی سے روشنی سے بندہ دیکھ سکتا ہے۔

(۴۴) گھٹاٹوپ اندھیرے مین کچھ نہ کچھ دیکھ سکنا بھی ایسی ہی نعمت ہے۔ جیسے زخمی آدمی کا بے ہوش ہو جانا کہ اس سے بے تکلیف نہیں ہوتی اسی طرح مکمل اندھیرے سے کچھ نہ دکھنا بھی خوف ہو ہر اس سے بچاؤ کی وجہ نعمت ہے۔

کان(EAR):

(۱)کان کا ہونا نعمت ہے۔

(۲)مناسب الخلقت ہونا بھی نعمت ہے۔

(۳)برابر ہونا بھی نعمت ہے۔

(۴)پردوں کا ہونا۔

(۵) قوت شنوائی کا ہونا۔

(۶)حد سے زیادہ نہ سن سکنا یعنی دنیا کی تمام آوازیں اگر کان میں پڑیں تو کچھ بھی سمجھ میں نہ آئے گا اس لیے محدود سن سکنا مستقل نعمت ہے۔

(۷)خوبصورت پیدائش اور بناوٹ۔

(۸)بن مانگے تندرست ملنا اور تندرست باقی رہنا۔

(۹)سماعت میں اگر تھوڑی بہت کمی آجائی تو اس کمی کا ذریعہ آلات دور ہو جانا۔

(۱۰)اگرچہ ہم دونوں کانوں سے الگ الگ سنتے ہیں مگر ایک آواز ایک ہی سنائی دیتی ہے دو نہیں۔

(۱۱)کان کی اندرونی دیواریں ایک بدبو دار مادہ خارج کرتی ہیں تاکہ گرد وغبار اور کیڑے مکوڑے اس میں پھنس جائیں اور سوتے میں کوئی چیونٹی وغیرہ کان میں نہ گھس سکے۔

(۱۲)امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کان کو پیچیدہ اور ٹیڑھا بنایا تاکہ آواز اچھی طرح بلند ہوکر اندر پہنچے اور موذی چیزیں (پانی، کیڑا یا ہوا وغیرہ) فوراً اندر نہ پہنچ سکیں اور ان کو دفع کیا جاسکے۔

(۱۳)امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کان پر سیپی کی شکل کا دونوں طرف ایک پنکھ سا بنایا تھا تاکہ آوازوں کو مجتمع کرکے سوراخ میں پہنچادے۔

(۱۴)کان میں ایک لاکھ ٹیلی فونی سماعتی خانے ہوتے ہیں یہ خانے آواز کو وصول کرکے دماغ تک پہنچاتے ہیں۔

(۱۵)کان ایک نازک حصوں سے بنا ہوا عضو ہے اس لیے اس کی نزاکت کی وجہ سے حفاظت کی خاطر کھوپڑی کے اندر اس کی جگہ بنائی گئی ہے۔

(۱۶)کان کے اندر پردہ کے آگے تین ہڈیاں باہم پیوست ہیں یہ ہڈیاں اونچی اور سخت آوازوں کو نرم کرکے آگے پہنچاتی ہیں۔

(۱۷)کان باہر کی طرف پھیلا ہوا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ آواز کی لہریں اکٹھی کرسکے بالکل ایسے جیسے لوگ چھت پر انٹینا لگاتے ہیں۔

خون(BLOOD):

(1) (۱)انسانی جسم میں ۷۵۰ کھرب خلیے ہیں جن میں سے صرف ۲۵۰ کھرب خلیے خون کے سرخ جسم میں ہیں۔

(۲)ایک جوان آدمی میں خون کی وہ مقدار جو ایک منٹ میں دل سے گزرتی ہے ۵ لیٹر ہے ،جسم کے سطحی رقبہ کے لحاظ سے یہ مقدار تین لیٹر فی منٹ ہے،بچوں ۱۰ سال میں یہ مقدار چار لیٹر فی منٹ اوراسی سال کی عمر میں یہ مقدار ۲ء۸ لیٹر فی منٹ ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ آخر میں انسانی جسم کی توانائی کم ہو جاتی ہے۔

(۳)ستر کلو گرام آدمی میں خون کی مقدار پانچ لیٹر ہوتی ہے اس میں تین لیٹر پانی (پلازما) ہوتا ہے۔

(۴)انسانی بدن میں خون شریانوں کو اگر ناپا جائے تو ان کی لمبائی ساٹھ ہزار سے ایک لاکھ میل لمبی ریلوے لائن کے برابر نکلے گی۔

(۵)خون کا وجود ہی ایک نعمت ہے کیونکہ خون جسم کے لیے اتنا ہی اہم ہے جتنا موٹر کے انجن کے لیے پیٹرول یا موبل آئل۔

(۶)خون کے ذریعے جسم کے تمام حصوں کا غذائیت پہنچتی ہے۔

(۷)خون ہی زہریلی گیس کاربن ڈائی آکسائیڈ کو جسم سے لے کر جاتا ہے۔

(۸)خون کے اندر سفید ذرات ہیں کریات بیضا ()جو انسانی جسم کو جراثیموں کے حملوں سے بچاتے ہیں۔

(۹)خون کے اندر سرخ ذرات ہیں کریات حمر ()ان میں ایک رنگ دار مادہ ہیموگلوبن ہوتا ہے جو آکسیجن کو جذب کرتا ہے، یہ پھیپھڑوں کی ہوا میں سے آکسیجن لے کر جسم کے تمام حصوں میں پہنچاتا ہے۔

(۱۰)ہمارے خون میں تقریباً دو چمچ شکر ہوتی ہے گو اس معمولی مقدار سے چائے کی پیالی بھی میٹھی ہوتی لیکن ہمارے خون میں شکر کی یہ معمولی مقدار اس قدر اہمیت رکھتی ہے کہ اگر اس مقدار سے چند ذرات بھی کم ہو جائیں تو مختلف امراض جسم پر حملہ آور ہوتے ہیں۔

(۱۱)خون کے اجزاء میں سے ایک سیال الدم(Plasma)ہے۔یہ ایسا سیال مادہ ہے جو خون میں موجود ذرات کی روانی میں مددگار ہوتا ہے۔

(۱۲)سیال الدم جسم کی مختلف بافتوں کو غذا پہنچاتا ہے۔

(۱۳)سیال الدم جسم انسان میں خون کو جمنے سے محفوظ رکھتا ہے۔

(۱۴)خون ہی تمام حصوں سے بے کار اور ضائع شدہ مادے مثلاً یوریا، یورک ایسڈ، کولیسٹرول وغیرہ لے کر ان اعضاء تک پہنچاتا ہے جو انہیں خارج کرتے ہیں۔

(۱۵)خون تمام جسم میں حرارت پہنچاتا ہے اور جسم کا درجہ حرارت قائم رکھتا ہے، صحت کی حالت میں جسم میں اس کی گرمی F``98.4ہوتی ہے۔

(۱۶)خون جسم کے اندر پانی کا توازن برقرار رکھنے میں مدد دیتا ہے۔

(۱۷)خون کا تنفس کے افعال میں مدد کرنا۔

(۱۸)خون کا اخراجی افعال میں مدد کرنا۔

(۱۹)خون کا غذائی افعال میں مدد کرنا۔

(۲۰)خون کا تنظیمی افعال میں مدد کرنا۔

(۲۱)خون کا مدافعتی افعال میں مدد کرنا۔

رگیں(VESSLES):

(۱)رگوں کا وجد ایک نعمت ہے۔

(۲)رگوں کا بغیر طلب کے ملنا اور صحیح سالم رہنا دوسری نعمت ہے۔

(۳)غذا جو ہم کھاتے ہیں اس کا کچھ حصہ فضلات کی شکل میں آنتوں وغیرہ کے راستے جسم سے خارج ہو جاتا ہے، لیکن کارآمد حصہ زیادہ تر انہی رگوں کے ذریعے آنتوں وغیرہ سے جذب ہو کر خون میں پہنچتا ہے۔

(۴)وریدیں جو ساکن رگیں ہیں تمام بدن کے خون کو اکٹھا کر کے دل تک پہنچاتی ہیں۔

(۵)وہ تڑپنے والی رگیں جو صاف خون کو جس میں آکسیجن ملی ہوتی ہے، دل سے لے کر تمام اعضاء میں پہنچاتی ہے۔شریانیں(Arteries) کہلاتی ہیں۔

دل(HEART):

دل کی ساخت: دل چار مختلف خانوں سے مل کر بنا ہے۔دو خانے اوپر والی منزل میں ہیں جنہیں اذن یا Auricle کہا جاتا ہے اور دو خانے نیچے ہیں جنہیں بطن یا Ventricle کہتے ہیں۔ دائیں اذن میں دو بڑیہ وردیدیں کے ذریعے اوپر اور نیچے والے دھڑ سے آکسیجن نکلا ہوا خون واپس آتا ہے اور بائیں اذن میں چار بڑی وریدوں کے ذریعے پھیپھڑوں سے آکسیجن ملا ہوا خون آتا ہے پھر یہ خون اپنے متعلقہ بطن میں انڈیل دیا جاتا ہے دائیں بطن سے یہ خون ایک بڑی شریان کے ذریعے پھیپھڑوں کو اور بائیں بطن سے تمام جسم کو روانہ کیا جاتا ہے۔

(۱)دل کا ایک ہونا مستقل نعمت ہے۔

(۲)دل میں سوراخ نہ ہونا دوسری بڑی نعمت ہے۔

(۳)ایک صحت مند آدمی کا دل ایک منٹ میں ستر تو نوے بار اور دن بھر میں ایک لاکھ بار اور ایک سال میں تقریباً کروڑ بار دھڑکتا ہے۔

(۴)دل ایک منٹ میں پانچ لیٹر خون پمپ کرتا ہے اور پندرہ سو گیلن خون بارہ ہزار میل لمبے دوران خون کے نظام شریانوں اور وریدوں میں فراہم کرتا ہے۔

(۵)دل خون کے پمپ کرنے اور خون کی فراہمی میں بجلی کی توانائی کا محتاج ہوتا ہے اور یہ بجلی دل اپنے سے حاصل کرتا ہے اس لیے کہ دل جس طرح پمپنگ اسٹیشن ہے اسی طرح خود اپنے لیے بجلی گھر بھی ہے۔

(۶)دل کی دھڑکن ایک نعمت ہے کیونکہ اگر یہ دھڑکنا بند کردے اور یہ کیفیت کچھ وقت تک برقرار رہے تو موت واقع ہو جاتی ہے۔

(۷)دل کے عضلات کو اللہ تعالیٰ نے ایسا بنایا ہے کہ کبھی تھکتا نہیں اور نہ ہی آرام کرتا ہے۔

(۸)دل جیسے اہم عضو کی حفاظت کی خاطر اللہ رب العزت کی ذات نے دونوں طرف سے ایک ایک درجن پسلیاں اور سامنے کی جانب سے ہڈی کا ڈھانچہ بنا دیا ہے۔

(۹)دل میں بہت سے باریک مسامات (سوراخ) ان مسانوں کے سامنے ہیں جو پھیپھڑے میں واقع ہیں جو کہ دل کا پنکھا ہے، اگر یہ سوراخ ہٹ جائیں اور ایک دوسرے کے سامنے نہ رہیں تو کبھی ہوا دل میں نہ پہنچ پائے اور انسان مر جائے۔

(۱۰)دل اپنی نسوں کی لمبائی کے ذریعے جسم میں دو کھلے شگافوں والے مقامات تک رہنمائی کرتا ہے یہ مقاما پھیپھڑے اور گردے ہیں۔پہلے مقام پر آکسیجن کے ذریعے خون کی صفائی ہوتی ہے جب کہ دوسرے مقام پر خوراک کی باقیات کی صفائی کا کام ہوتا ہے۔

(۱۱) دل کی جھلی بھی خدا کا بنایا ہوا شاہکار نمونہ ہے اس دو تہوں والی جھلی کا کام یہ ہوتا ہے کہ جب وہ دھڑکتا ہے تو اسے نزدیک واقع اعضاء سے محفوظ رکھے۔ اس مقصد کے لیے اس جھلی کے باہر والی دیوار ایک تو دل کی پسلیوں کے نزدیک سینے سے چپکائے رکھتی ہے دوسرے یہ اپنے اندرونی جھلی کے درمیان جگہ میں ایک مختصر سی رطوبت چھوڑتی رہتی ہے۔

(۱۲) دماغ سے اعصابی ریشے نکلتے ہیں جو کہ دل کی رفتار کو بھی ضرورت کے مطابق کم یا زیادہ کرسکتے ہیں۔ مثلاً دوڑتے ہوئے شخص کی دل کی رفتار بھی زیادہ ہوجاتی ہے اور دل کا عضلہ زیادہ قوت سے سکڑتا ہے تاکہ زیادہ مقدار میں خون کی ترسیل ہوسکے۔

(۱۳) دل کی دھڑکن کی وجہ سے نبض کی رفتار بنتی ہے۔

(۱۴) دل اللہ تعالٰی کی نعمت ہے جس کے بغیر زندگی کا تصور محال ہے کیونکہ اگر کان، ناک، یا جسم کا کوئی اور عضو نہ بھی ہو تو زندگی ممکن ہے مگر دل کے بغیر چند لمحے بھی نہیں رہا جاسکتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ تمام انسانی جسم میں دل سے بڑی کوئی نعمت نہیں تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ اسی کی بدولت زندگی کو دوام اور ایمان کو بقا حاصل ہے۔

فائدہ:

دل جسامت میں مٹھی کے برابر ہے۔ دل کا طول تقریباً بارہ سینٹی میٹر 12cm، چوڑائی نو سینٹی میٹر 9cm اور دبازت (موٹائی) چھ سینٹی میٹر 6cm ہے۔

قلب کا اوسط وزن مردوں میں 300 گرام اور عورتوں 250 میں گرام ہے۔ دل ایک منٹ میں پانچ لیٹر خون پمپ کرتا ہے اور 45 سال کی عمر تک دل تقریباً 3 لاکھ ٹن خون پمپ کرچکا ہوتا ہے۔ ایک صحت مند انسان کا دل ایک منٹ میں 70 سے 90 بار دھڑکتا ہے۔ دل کی تین دھڑکنوں میں

ایک پیالی خون خارج ہوتا ہے۔ ایک آدمی اگر ستر سال زندہ رہے تو دل 4 کھرب دفعہ دھڑکے گا اور اس دوران دس کروڑ گیلن خون کا اخراج کرے گا۔ بچہ جب رحم مادر میں ہوتا ہے تو دل حرکت کرنے لگتا ہے اور پھر یہ حرکت موت تک جاری رہتی ہے۔ دل چوبیس گھنٹے میں اتنی قوت صرف کرتا ہے جو تین فٹ اونچے پلیٹ فارم پر بیس ٹن کوئلہ چڑھانے کے لیے کافی ہوتی ہے۔

ناک(NOSE):

(۱)ناک کا ہونا بھی نعمت ہے۔

(۲)ناک کا ٹھیک ہونا دوسری نعمت ہے۔

(۳)مناسب الخلقت ہونا بھی نعمت ہے۔

(۴)ناک کی بدولت چہرہ کا خوبصورت اور خوشنما دکھائی دینا۔

(۵)ناک کے اندر نتھنے بنائے ہیں اور ان میں قوۃ شامہ (سونگھنے کی قوت) رکھے تاکہ انسان خوشبوؤں کو سونگھ سکے اور بدبو سے دور ہو سکے۔

(۶)ناک کے ذریعہ تازہ ہوا حاصل ہوتی ہے جو کہ دل کی غذا ہے۔

(۷)اللہ تعالیٰ نے ناک کے اندر بال پیدا فرمائے تاکہ ہوا کہ ساتھ آنے والا اگر دوغبار اور جراثیم ان بالوں سے الجھ کر باہر ہی رہ جائیں اندر نہ جاسکیں اور اگر کچھ جراثیم اندر داخل ہوتے بھی ہیں تو ناک اور سانس کی نالی میں باریک بال اور اس کی رطوبت ان کو روک لیتی ہے جس کی وجہ سے پھیپھڑے خطرناک بیماریوں کے جراثیوں سے بچ جاتے ہیں۔

(۸)انسانی ناک ہی کے ذریعے سانس لیتا ہے جو کہ اس کی زندگی کو قائم رکھتا ہے۔

(۹)کوئی چیز اگر دفعتاً ناک میں داخل ہو تو چھینک کے ذریعے اس کو نکال باہر کیا جاتا ہے۔ چھینک دینا بھی جسم کی مدافعت کرنا ہے اس لیے حکم ہے کہ چھینک کے بعد اللہ کا شکر ادا کرو، یعنی الحمد اللہ کہو۔

(۱۰)اگر چھینک کرنے سے بھی جراثیم نہ ٹل سکیں تو کھانسی کرنے سے یہ خطرناک جراثیم جسم سے نکال دیئے جاتے ہیں۔

(۱۱)ناک کا اوپر والا حصہ سونگھنے میں مدد دیتا ہے جہاں باری تعالیٰ نے ایک خاص قسم کی جھلی بنائی ہے جو اور کہیں نہیں ہے۔

(۱۲)ناک کی ہڈیاں پتلی اور کھوکھلی بنائی ہیں جو بولتے وقت آواز پیدا کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

(۱۳)ناک ہوا کو مرطوب بنانے کے لیے تقریباً چوتھائی گیلن نمی روزانہ پیدا کرتا ہے۔

(۱۴)ناک کے اندر ایک خوردبینی جھاڑو ہے۔ اس جھاڑو کے اندر غیر مرئی روئیں ہیں جو مضر جراثیم کو ہلاک کر دیتی ہیں۔ نیز ان کے پاس ایک ایسا دفاعی نظام ہے۔ جس کو انگریزی زبان میں Lysozium کہتے ہیں اس دفاعی نظام کے ذریعے سے ناک آنکھوں کو خطرناک بیماری سے بچاتی ہے
۔

(۱۵)جو نماز وضو کرتے وقت ناک کے اندر پانی ڈالتا ہے تو پانی کے اندر کام کرنے والی برقی رو ناک کے اندر غیر مرئی روؤں کی کارکردگی کو تقویت پہنچاتی ہے جس کے نتیجہ میں وہ بے شمار پیچیدہ بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے۔

(۱۶)اگر خدانخواستہ ناک اپنا کام کرنا چھوڑ دے تو مختلف ذائقوں میں امتیاز نہی کیا جاسکتا۔

(۱۷)نزلہ وغیرہ کا ناک کے ذریعہ بہہ جانا بھی نعمت ہے۔

(۱۸)ناک کا بن مانگے بے عیب ملنا اور تندرست باقی رہنا مستقل نعمت ہے۔

گلا(THROAT):

(۱) گلے کا ہونا ایک نعمت ہے۔

(۲) گلے کا تندرست ہونا دوسری نعمت ہے۔

(۳)سانس کا راستہ ہونا۔

(۴)غذا کا نگلنا۔

(۵)بن مانگے صحیح رہنا۔

(۶)مناسب الخلقت ہونا۔

(۷)خلق(Pharynx)میں دو سوراخ کا ہونا۔ آگے والا سوراخ سانس کی نالی میں کھل جاتا ہے اور پیچھے والا سوراخ خوراک کی نالی میں کھلتا ہے۔سانس کی نالی پر ایک پردہ ہے جو خوراک نگلتے وقت سانس کی نالی کو بند کر دیتا ہے اور اس کام کو کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ مقرر کر دیا ہے اگر اللہ کا حکم ہو گا تو فرشتہ سانس کی نالی کو بند کر دے گا اور خوراک کو اپنی صحیح جگہ سے نیچے لے جائے گا۔

(۸)انسان کی حفاظت اور حلق کو تر رکھنے کے لیے لعاب کا پیدا ہونا جو ہر وقت منہ میں اتنی مقدار میں موجود رہتا ہے جو حلق کو سوکھنے نہیں دیتا۔

پھیپھڑے(LUNGS):

(۱) پھیپھڑے کا ہونا ایک نعمت ہے۔

(۲)بن مانگے ملنا اور تندرست رہنا نعمت ہے۔

(۳) پھیپھڑے کا پھولنا اور سکڑنا نعمت ہے، ایک آدمی کی اوسط زندگی میں پھیپھڑے 50 کروڑ مرتبہ پھولتے اور سکڑتے ہیں۔ انسان کی بنائی ہوئی مشین نہ ایسی مشقت برداشت کر سکتی ہے اور نہ ہی بغیر مرمت ہوئے اتنا لمبا عرصہ اپنا کام جاری رکھ سکتی ہے۔

(۴) پھیپھڑوں کے چھوٹے چھوٹے بال گرد و غبار کو باہر نکالتے ہیں۔ گویا کہ یہ بال فلٹر ہیں۔

(۵)ہمیں روزانہ اپنے جسم میں پھیپھڑے کے ذریعے پندرہ سو مکعب انچ اور چمڑی کے ذریعے سے 300 مکعب انچ صاف ہوا لینی چاہیئے جو کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے پوری کر دیتے ہیں۔

(٦) پھیپھڑے کے ذریعے انسان سوتے جاگتے ہر لمحہ سانس لیتا رہتا ہے۔

فائدہ:

ایک منٹ میں آدمی سولہ سے اٹھارہ مرتبہ سانس لیتا ہے اور پورے دن بھر میں 24 ہزار مرتبہ سانس لیتا ہے۔ ہر ایک سانس میں 25 سے 30 انچ ہوا اندر جاتی ہے۔ یہ ہوا پھیپھڑے کی 15 مربع فٹ جگہ میں چکر الگاتی ہے۔ ایک دن میں آدمی سانس کے ذریعے 14 ہزار 4 سو گیلن ہوا کھینچا ہے۔

منہ (MOUTH):

(۱)منہ ہونا ایک نعمت ہے۔

(۲)درست ہونا دوسری نعمت ہے۔

(۳)بد شکلی سے محفوظ ہونا بھی نعمت ہے۔

(۴)منہ کا کھلنا۔

(۵)منہ کو مرکزی حیثیت ملنا۔

(۶)جامع النعم ہونا۔

(۷)خوبصورت ہونا۔

(۸)بن مانگے عطاہونا۔

(۹)بن مانگے صحیح رہنا۔

(۱۰)صفائی سے بننا۔

(۱۱)ہنسنے کی حدود کاہونا۔

(۱۲)ہر ایک کی شکل کا مختلف ہونا کتنی بڑی نعمت ہے ورنہ پہچان بہت دشوار ہوتی۔

ہونٹ(LIP):

(۱)ہونٹ کاہونا نعمت ہے۔امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:اگر خوبصورت دانتوں پر ہونٹ نہ ہوتے تو چہرہ کتنا بدصورت وبدہیئت ہوتا۔

(۲)دونوں ہونٹوں کا تندرست وبلا عیب ہونا۔

(۳)دونوں ہونٹوں کا برابر ہونا۔

(۴)محبت کی طرف مشیر ہونا۔

(۵)بولنے میں بھی ہونٹ کا بڑا ہاتھ ہے۔

(۶)بن مانگے صحیح رہنا۔

(۷)ہڈی نہ ہونا۔

(۸)مسکراہٹ میں ہونٹوں کا معین ہونا۔

(۹)مسکراہٹ میں ہونٹوں کا معین ہونا۔

(۱۰)ہونٹوں سے کھانا کھانے میں بہت مدد ملتی ہے۔

(۱۱)ہونٹوں سے مسوڑوں اور دانتوں کی حفاظت کا کام بھی لیا جاتا ہے۔

دانت(TEETH):

(۱)دانت کا وجود ایک نعمت ہے۔

(۲)تندرست ہونا دوسری نعمت ہے۔

(۳)پکے ہوئے ہونا بھی نعمت ہے۔

(۴)اگر دانت نہ ہوتے تو کھانا نہایت مشکل تھا۔

(۵)سفید ہونا۔

(۶)متناسب ہونا۔

(۷)خلال کی گنجائش ہونا۔

(۸)بن مانگے ملنا اور باقی رہنا۔

(۹)دانتوں کی بناوٹ دیکھئے کہ قدرت نے انہیں بتیس ٹکڑوں میں بنایا ہے سب کو ایک سالم ہڈی کے ٹکڑے کی طرح نہیں بنایا ورنہ منہ کے اندر اس سے بہت اذیت ہوتی ہے۔ موجودہ صورت میں اگر ایک دانت خراب ہو جائے تو دوسرا اس کا نعم البدل ثابت ہوتا ہے۔

(۱۰)دانت کا نرم (گوشت) کی طرح نہ ہونا بھی نعمت ہے۔

(۱۱)دانتوں کے اطراف میں داڑھیں بنائیں تا کہ سخت چیزوں کو کاٹنے کے لیے ان سے مدد لی جاسکے۔

(۱۲)دانتوں کی وجہ سے چہرے کا حسن دوبالا ہوتا ہے۔

(۱۳)دانتوں کے خراب ہونے کی صورت میں مصنوعی دانت بھی قدرت ہی کا انتظام ہے۔

(۱۴) اللہ رب العزت کی ذات نے شیر خوار بچوں کو نرم وعارضی دانت عنایت فرمائے مگر جونہی بچہ بڑا ہونے لگتا ہے تو یہ عارضی دانت گرنے لگتے ہیں اور بتدریج مستقل دانت کی جگہ لے لیتے ہیں۔ چنانچہ دودھ کے دانت بیس ہوتے ہیں ہر جانب اریچے پانچ پانچ، یہ چھ سال تک ساتھ دیتے ہیں اسی دوران ایک ایک داڑھ مستقل آجاتی ہے اور اس طرح کل دانت 24 ہوگئے پھر سامنے والے گرتے ہیں اور نئے آجاتے ہیں پھر بتدریج 28 ہو جاتے ہیں۔ سترہ، اٹھارہ سال کی عمر میں ایک ایک عقل داڑھ آجاتی ہے اس طرح کل دانت 32 ہو جاتے ہیں۔

(۱۵) نارمل خوراک چبانے میں 350PSI پونڈ کی طاقت استعمال ہوتی ہے اور اس پریشر پر انگلی کٹ چکتی ہے۔

(۱۶) دانتوں کے اوپر کی کھال نہایت سخت رکھی اگر دانتوں کی یہ کھال نرم ہوتی تو پھر دانتوں کا جمے رہنا مشکل ہو جاتا۔

(۱۷) دانت ہونٹوں کی ٹیک کا کام بھی دیتے ہیں اور ان کو منہ کے اندر جھکنے سے روکتے ہیں۔

فائدہ: دانتوں کی بڑی بیماریاں:

دانتوں کی دو بیماریاں ایسی ہیں جن کی وجہ سے علاج معالجہ کی ضرورت پڑتی ہے۔

(۱) **کیڑا لگنا:** یہ قدرتی مرض ہے، جہاں لیکٹر یا شروع ہوتا ہے دانت سڑتا شروع ہو جاتے ہیں ، عموماً جہاں مسواک یا برش کی پہنچ نہیں ہوتی وہاں یہ ہلکے درجہ میں شروع ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ یہ بڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔

(۲)خون آنا: دوسرا بڑا مرض دانتوں میں خون کا آنا ہے یہ بھی نوے فیصد دانت صاف نہ کرنے سے ہوتا ہے۔

زبان(TONGUE):

(۱)زبان کا ہونا نعمت ہے۔

(۲)مناسب الخلقت ہونا بھی نعمت ہے۔

(۳)بغیر ہڈی کے ہونا۔

(۴)نرم ہونا۔

(۵)منہ کے اندر ہونا۔

(۶)لعاب کا ساتھ ہونا یعنی زبان کا تر رہنا۔

(۷)قوت گویائی کا ہونا۔

(۸)لکنت نہ ہونا یعنی بلا عیب ہونا۔

(۹)زبان کی پائیداری کہ ساری زندگی ہمارا ساتھ دیتی ہے ورنہ انسان کے ہاتھ کے بنائے ہوئے آلات ایک مدت کے بعد ناکارہ ہو جاتے ہیں۔

(۱۰)زبان پر اللہ تعالیٰ نے تین ہزار خانے ذائقے کے بنائے ہیں جن سے ہم مٹھاس، کرواہٹ اور کھٹائی وغیرہ محسوس کرتے ہیں۔

(۱۱)بن مانگے صحیح رہنا۔

(۱۲)مختلف زبانوں میں گفتگو کر سکنا۔

(۱۳)زبان کی مدد سے لقمے کو ادھر ادھر کرنے اور کھانے میں مدد ملتی ہے۔

(۱۴)زبان بہت نازک عضو ہے لیکن اللہ تعالیٰ بتیں چھریوں میں اس کی حفاظت کرتے ہیں۔

(۱۵)اشیاء کے گرم اور سرد ہونے کا بھی زبان سے پتہ چلتا ہے۔

لعاب(SALIVA):

(۱)لعاب جس میں تقریباً 98فیصد پانی ہوتا ہے اس کو وجود نعمت ہے۔

(۲)لعاب غذا کو تر اور چکنا کر کے نگلنے میں آسانی پیدا کرتا ہے۔

(۳)لعابِ غذا کے ذرات کو باہم چپکا کر لقمے کی شکل بنالیتا ہے جو ایک صورت میں نگل لیا جاتا ہے۔

(۴)لعاب ہضم کے عمل کی ابتدا کرتا ہے۔

(۵)لعاب منہ کی صفائی کرتا ہے اور دانت کی حفاظت کرتا ہے۔

(۶)لعاب کا مناسب ہونا بھی نعمت ہے،قدرت نے لعاب کو منہ کے اندر اس طرح پوشیدہ رکھا ہے کہ کھانے پینے کے وقت پیدا ہوتا ہے اگر کھانے کے علاوہ منہ میں ہمیشہ لعاب بھرا رہتا تو منہ کا کھولنا نہایت مشکل ہو جاتا،منہ کھولتے وقت لعاب باہر آجاتا اور بات کرنے میں سخت دشواری پیش آتی۔

(۷)کھانا کھا چکنے کے بعد لعاب صرف اتنا جاری رکھا جس سے حلق تر رہے اور سوکھنے نہ پائے ورنہ حلق خشک ہونے سے دم گھٹنے لگتا اور انسان ہلاکت کے منہ میں چلا جاتا۔نیز تری اتنی باقی رکھی جس سے گویائی میں آسانی رہے۔

پیٹ(BELLY):

(۱)پیٹ کا ہونا نعمت ہے۔

(۲)درست ہونا بھی نعمت ہے۔

(۳)مناسب ہونا۔

(۴)ربڑ کی طرح کا ہونا۔

(۵)موٹا یا پتلا ہونے سے تکلیف نہ ہونا۔

(۶)فضلہ اپنے اندر سموئے رکھنا۔

(۷)ناف کا ہونا۔

(۸)پیٹ وناف کا مناسب ہونا۔

(۹)سانس لینے میں دشواری نہ ہونا۔

(۱۰)بن مانگے درست رہنا۔

معدہ(STOMACH):

(۱)معدہ وہ عضو ہے جس میں غذا جا کر ہضم ہو جاتی ہے۔

(۲)معدہ کا ہونا نعمت ہے۔

(۳)معدہ کا تندرست ہونا دوسری نعمت ہے۔

(۴)بن مانگے درست رہنا بھی نعمت ہے۔

(۵)غذا جب معدہ میں داخل ہوتی ہے تو وہاں نمک کا تیزاب خوراک میں موجودہ مختلف قسم کے جراثیموں کو مار دیتا ہے اور معدہ کے نمک کا یہ تیزاب اس قدر تیز ہوتا ہے کہ وہ خوراک میں لی گئیں تمام اشیاء پر اثر انداز ہوتا ہے مگر معدہ اس کے اثر سے محفوظ رہتا ہے اس لیے کہ معدہ کی

دیواروں پر ایک مخصوص قسم کی چکنی اور لیس دار تہہ عشائے مخاطی موجود ہوتی ہے جس کی موجودگی معدے پر تیزاب کو اثر ڈالنے نہیں دیتی۔

(۶)معدہ کے اندر ساڑھے تین کروڑ کے قریب غدود ہوتے ہیں جن سے خاص کیمیائی مادوں کا اخراج ہوتا ہے۔

جگر(LIVER):

جگر کی ساخت اور مقام: جگر انسانی جسم میں سب سے بڑا غدہ(غدود) ہے۔اس کا رنگ سیاہی مائل سرخ ہوتا ہے۔اس کا وزن ڈیڑھ سے دو کلو تک ہوتا ہے۔یہ پیٹ کے دائیں طرف پسلیوں کے نیچے معدے کے اوپر ہوتا ہے۔اس کے دو بڑے لوتھڑے ہوتے ہیں۔دایاں لوتھڑا بڑا اور بایاں لوتھڑا چھوٹا ہوتا ہے جس کا کچھ حصہ بائیں پسلیوں کے نیچے تک آجاتا ہے۔جگر کی اوپری سطح گول اور نیچے کی سطح پر پانچ شگاف ہوتے ہیں جو جگر کو پانچ چھوٹے لوتھڑوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔

(۱)جگر کا وجود ایک نعمت ہے۔

(۲)جگر کا تندرست ہونا بھی نعمت ہے۔

(۳)بغیر طلب کے مل جانا بھی نعمت ہے۔

(۴)جگر کا حرارت پیدا کرنا نعمت ہے۔

(۵)جگر کا معدنی اجزاء اور خاص کر لوہے و تانبے کو محفوظ کرنا جو خون بناتے ہیں۔

(۶)جگر کا خون کے سرخ خلیات بنانا۔

(۷)جگر کا قلت خون بنانے والے عنصر کا ذخیرہ کرنا

(۸)صفراء اور افراز جگر کا خاص فعل ہے اور صفراء غذا کو ہضم کرنے میں مدد دیتا ہے۔

(۹) جگر میں اربوں ایسے خلیوں کا ہونا جو جسم میں پائے جانے والے دوسرے خلیوں سے مختلف ہوتے ہیں اور اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ خوردبین کے بغیر ان کا مشاہدہ ممکن نہیں۔

(۱۰) جگر کا انسانی خدمت سے نہ تھکنا بھی نعمت ہے۔ جگر انسان کی خدمت ماں کی پیٹ سے شروع کرتا ہے اور ساری زندگی خدمت کو انجام دیتا رہتا ہے۔

(۱۱) جگر کا مختلف افعال انجام دینا۔ کیونکہ جگر میں شکر، لحمیات، نمکیات، وٹامن وغیرہ بنتے ہیں۔ جگر کے افعال اس قدر ہیں کہ سائنس دان اس کا نعم البدل نہیں پیش کر سکتے۔

(۱۲) آنتوں سے جذب ہونے والی گلوکوز کا بڑا حصہ جگر اپنے اندر ذخیرہ کر لیتا ہے اور ضرورت کے وقت جسم کو توانائی فراہم کرنے کے لیے دے دیتا ہے۔

(۱۳) جگر کو جسم کو زہریلے اجزاء سے محفوظ رکھنا بھی نعمت ہے۔

(۱۴) جگر کا خون میں شکر کی سطح کو متوازن رکھنا مستقل نعمت ہے۔

(۱۵) جگر کو حیوانی شکر گلائیکوجن تیار کرنا بھی غیر معمولی نعمت ہے۔

(۱۶) جسم میں موجود غیر ضروری اجزاء کو جسم سے خارج کرنا۔

(۱۷) جگر کا غذا کو ہضم کرنے میں مدد دینے والے خیر ازائم کا پیدا کرنا۔

(۱۸) اگر اناسن کو سردی لگ جائے تو جگر جسم کو گرمانے کے لیے اس قدر صفرا خارج کرتا ہے کہ آنکھیں اور چہرہ زرد ہو جاتا ہے۔

(۱۹) قدرت نے جگر میں بڑھنے کی بھی طاقت رکھی ہے، اگر جگر کا ایک بڑا حصہ بیماری کی وجہ سے نکال دیا جائے تو باقی جگر آہستہ آہستہ بڑھ کر بڑا ہو جاتا ہے۔

(۲۰) جگر کا نیا خون بنانے میں اپنا حصہ ادا کرنا یہاں تک کہ بچے کی پیدائش سے پہلے بھی جنین میں جگر خون کے سرخ وسفید دانے بنانے کا اہم کارخانہ ہے۔

(۲۱) جگر کا ایک خاص کیمیائی مادہ "ہیپارین" کو بنانا یہ مادہ عروق میں خون کو جمنے سے روکتا ہے۔

پتہ (مرارہ)(GALL BLADDER):

(۱) پتہ کا ہونا نعمت ہے۔

(۲) بغیر طلب وجستجو کے مل جانا بھی نعمت ہے۔

(۳) بن مانگے تندرست ہونا اور تندرست رہنا بھی نعمت ہے۔

(۴) پتہ ایک تھیلی نما عضو ہے جس میں جگر سے پیدا ہونے والے پتہ یا صفراء جمع رہتے ہیں اور جب کھانا ہضم کرنے کا عمل شروع ہوتا ہے تو صفراء پتہ میں سے نکل کر چھوٹی آنت میں قطرہ قطرہ ٹپکتا ہے اور چربیلی غذائیں ہضم کرتا ہے۔

(۵) پتہ آنتوں میں موجود غذا میں سرانڈ پیدا نہیں کرتا ہے۔

(۶) پتہ کا آنتوں میں براز کو خارج کرنے (اجابت) کی تحریک پیدا کرنا اور براز میں بدبو پیدا نہ ہونے دینا، براز کا مخصوص رنگ پتے کی رطوبت کے شامل ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے۔

تلی (طحال)(SPLEEN):

تلی کی ساخت اور مقام: تلی ایک ایسا غدہ (گلٹی) ہے کہ جس کی کوئی نالی نہین ہے اس کی شکل چپٹی مستطیل ہوتی ہے، اس کی رنگت سرخ سیاہی مائل ہوتی ہے۔ تندرست آدمی میں تلی کی لمبائی تقریباً پانچ انچ، چوڑائی تین یا چارانچ، موٹائی ڈیڑھ انچ اور وزن تقریباً اڑھائی یا تین چھٹانک تک ہوتا ہے۔ یہ پیٹ کے بائیں طرف نیچے والی پسلیوں کے نیچے ہوتا ہے۔

(۱) تلی کا وجود ایک نعمت ہے۔

(۲) تلی کے بغیر طلب و جستجو کے مل جانا بھی نعمت ہے۔

(۳) تلی کا بن مانے تندرست رہنا بھی نعمت میں داخل ہے۔

(۴) تلی کا خون کے ضائع شدہ جسم میں خون سے علیحدہ کرنا۔

(۵) تلی کا ایک قسم کی اندرونی رطوبت تیار کرنا جو رطوبت لبلبہ بننے میں مدد دیتی ہے۔

فائدہ عجیبہ:

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں کہ "فقہ مالکہ کی مشہور کتاب فیض الرحمٰن"ص ۲۳۱ میں بحوالہ حیوۃ الحیوان مذکور ہے کہ علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو شخص اس پر مداومت کرے کہ جب جوتا پہنے تو پہلے دایاں اور پھر بایاں پہنے اور جب نکالے تو پہلے بایاں اور پھر داہنا نکالے وہ تلی کے درد سے ماموں رہے گا۔ک[17]

لبلبہ(PANCREAS):

لبلبہ کی ساخت اور مقام: لبلبہ یہ تلی کے ساتھ مثل گردن کے لگاہوا دکھائی دیتاہے ،لبلبہ دراصل ایک قسم کی گلٹی یاغدہ ہے جس کی شکل کتے کی زبان جیسی ہوتی ہے۔اس کی لمبائی چھ انچ اور چوڑائی ڈیڑھ انچ،موٹائی سوا انچ اور وزن تقریباً ایک چھٹانک سے تین چھٹانک تک ہوتاہے۔

(۱)لبلبہ کا ہونا نعمت ہے۔

(۲)بغیر طلب و جستجو کے مل جانا بھی نعمت ہے

(۳)بغیر درخواست کیے تندرست ہونا اور تندرست باقی رہنا۔

---

[17] ثمرات الاوراق کشکول ص ۶۲

(۴)لبلبہ میں اندرونی افراد کا پیدا ہونا اور خون میں شامل ہوتے رہنا جیسے انسولین (Insulin) کہتے ہیں، اگر یہ افراد صحیح مقدار میں پیدا ہو کر خون میں شامل نہ ہو تو نشاستہ دار غذائیں اور شکر ہضم ہو کر جزوبدن نہ بن سکے، شوگر کا مرض انسولین کی کمی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ چنانچہ شوگر کے مریض کا مصنوعی انسولین کے ذریعے علاج کیا جاتا ہے۔

گردہ (KIDNEY):

گردہ کی شکل اور مقام: گردے تعداد میں دو ہوتے ہیں۔ ایک دائیں طرف اور دوسرا بائیں طرف، ہر ایک گردہ گیارہویں پسلی کے نیچے پیٹ کے پچھلی جانب کمر کے مقام پر واقع ہوتا ہے۔ داہنا گروہ جگر کے باعث بائیں گروہ سے ذرا نیچے ہوتا ہے۔ گردے کی شکل لوبیئے جیسی ہوتی ہے۔ جسمات میں چار انچ لمبا، دو انچ چوڑا اور ایک انچ موٹا ہوتا ہے۔ اس کی رنگت سرخی مائل بھوری ہوتی ہے۔ اس کی ساخت نیفرون پر مشتمل ہوتی ہے۔

(۱) گردہ کا ہونا نعمت ہے اس کے بغیر آپ زیادہ عرصہ تک زندہ نہیں رہ سکتے۔

(۲) گردہ کا بغیر طلب و جستجو کے مل جانا بھی نعمت ہے۔

(۳)بن مانگے گردہ کا تندرست ہونا اور تندرست رہنا اور اپنا عمل کرتے رہنا۔

(۴) گردے کا سب سے بڑا اور اہم کام خون کا صاف رکھنا ہے۔ یہ زہریلے اجزاء کو جسم سے پیشاب کی صورت میں خارج کرتے ہیں گویا کہ یہ فلٹر پلانٹ کا کام کرتے ہیں نیز دونوں گردوں میں 24لاکھ فلٹری پلانٹ لگے ہوتے ہیں اور ہر پلانٹ پیشاب بنا سکتا ہے۔

(۵) گردوں کا دوسرا اہم کام جسم میں خون کا حجم (مقدار)، پانی کا حجم، معدنی اور غذائی اجزاء کا تناسب برقرار رکھنا ہے۔

(۶)انسانی جسم میں ایک حد تک سوڈیم، پوٹاشیم، کیلشیم، میگنیشیم، فولاد، شکر، نمک وغیرہ کی ایک خاص مقدار انسان کی نشوونما کے لیے ضروری ہوتی ہے لیکن جب ان ضروری اجزاء کی مقدار زیادہ ہو جاتی ہے تو فلٹر پلانٹ یعنی گردے ان کو پیشاب کی صورت میں خارج کر دیتے ہیں۔

(۷)ہر روز انسانی گردوں سے دوسو لیٹر پلازما(خون کا مائع جز) فلٹر ہوتا ہے۔

شرم گاہ(PENIS):

(۱)شرم گاہ کا ہونا نعمت ہے۔

(۲)مناسب الخلقت ہونا بھی نعمت ہے۔

(۳)درست انداز سے کام کرنا بھی نعمت ہے۔

(۴)خواہشات کا پورا کر سکنا۔

(۵)پیشاب کا ارادہ کرنے سے پیشاب کا آجانا۔

(۶)ہڈی کا نہ ہونا حتیٰ کہ ہڈی سے استنجاء بھی نہ کرنا۔

(۷)نسل انسانی کو بحکم الٰہی باقی رکھ سکنا۔

(۸)حقوق واجبہ کا ادا ہونا۔

(۹)بغیر درخواست کیے درست رہنا۔

(۱۰)آلہ تناسل کی ساخت کا عجیب ہونا نہ تو اس کو بالکل ڈھیلا رکھا کہ مادہ رحم تک نہ پہنچ سکے نہ ایسا سخت کے چلنے پھرنے میں دشواری ہو۔ اس میں گھٹنے کی بھی صلاحیت رکھی اور بڑھنے کی بھی۔

(۱۱)بعد ازاں انزال باعث تسکین ہونا۔

(۱۲)گھر میں پاخانے کی جگہ آڑ میں بنائی جاتی ہے اور یہی مناسب ہے دیکھئے قدرت کا عمل بھی یہی ہے کہ پاخانہ کا مقام ایک ایسی جگہ بنایا جو بدن بھر میں سب سے زیادہ چھپی ہوئی ہے، بدن کے پورے آدھے دھڑ نے اس کو چھپا رکھا ہے پھر مزید رانوں پر گوشت زیادہ چڑھایا تا کہ ایک گونہ پردہ میں ہو جائے۔

(۱۳)خصیوں(Testes)کا ہونا بھی نعمت ہے۔کیونکہ یہ افزائش نسل کے لیے مردانہ جراثیم پیدا کرتے ہیں۔

(۱۴)خصیے اندرونی رطوبت پیدا کرتے ہیں جو مردانہ خصوصیت یعنی داڑھی، مونچھوں وغیرہ کا اُگنا اور آواز کی تبدیلی کو پیدا کرتے ہیں۔

(۱۵)عورتوں میں فرج کا ہونا نعمت ہے بایں معنی کہ جماع کے وقت مرد کا آلہ تناسل اس میں داخل ہوتا ہے اور مرد کا مادہ منویہ اسی کے ذریعے عورت کے اندرونی اعضاء نسلی میں پہنچتا ہے۔

(۱۶)فرج(Vagina) ہی کے راستے سے جنین دنیا میں آتا ہے۔

(۱۷)فرج ہی کے راستے حیض و نفاس خارج ہوتے ہیں۔

رحم(UTERUS):

(۱)رحم کا ہونا نعمت ہے۔

(۲)رحم کا بن مانگے ملنا بھی نعمت ہے۔

(۳)رحم کا تندرست رہنا بھی نعمت ہے۔

(۴)رحم کا بچے کی آماجگاہ ہونا۔

(۵)رحم بچے کی حفاظت کرتا ہے اور اسے صدمات سے محفوظ رکھتا ہے۔

(۶) حیض اسی میں سے آتا ہے۔

(۷) رحم کی دو نالیاں ہوتی ہیں پیدائش کے نقطۂ نظر سے یہ نالیاں نہایت اہم حیثیت رکھتی ہیں کیونکہ مرد کا جرثومہ منی اور عورت کے انڈے کا ملاپ اسی نالی کے بیرونی آخری حصہ میں ہوتا ہے اور اسی جگہ انڈا بار آور ہوتا ہے۔[18]

شیطان کی مخالفت اور رحمتِ الٰہی

اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرمائے جس نے شیطان کے خلاف کیا اور گناہوں سے دور رہا دوزخ سے بچا۔ اللہ تعالیٰ اس کو نیکیوں کی مزید بہت ہمت دے اور رحمٰن کے ذکر میں ہمیشہ اس کو مشغول ومصروف رکھے کیونکہ اس نے بسم اللہ کہا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرمائے جس نے اللہ کو مضبوط پکڑا اس کی طرف رجوع کیا ہو اور اللہ پر توکل کیا اور اس کے ذکر میں مشغول رہا۔ کیونکہ اس نے بسم اللہ پڑھی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس بندے پر رحم فرمائے جس نے دنیا سے نفرت کی اور آخرت کا شائق رہا اور تکلیفوں پر صبر اور اللہ کی نعمتوں پر شکر ادا کیا، مولیٰ کے ذکر میں ہمیشہ محو رہا کیونکہ اس نے بسم اللہ کہا ہے۔

تبریک وتہنیت ہے اس بندے کے لئے جس نے شیطان سے پرہیز کیا اور قوت لایموت پر قناعت کی۔ (بقدر ضرورت روزی حاصل کرنے پر) اور اس خدا کے ذکر میں مصروف ومشغول رہا۔ جو حی لایموت ہے لہٰذا تم بھی بسم اللہ کہو۔

بسم اللہ کے کلمات کی فرداً فرداً دلچسپ تحقیق

اسم اللہ جل جلالہ کی علمی تحقیق:

[18] (از اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی حیرت انگیز بارش)

اہلِ علم نے اس پر بحث کی ہے کہ اسمِ اللہ ذات سے مشتق ہے یا جامد، متعدد علماء اس بات کے قائل ہیں کہ یہ جامد لفظ ہے نہ یہ کسی سے ماخوذ ہے نہ اس سے کوئی دوسرا لفظ ماخوذ ہے گویا جو مسمی کی شان ہے۔ وہی اسم کی ہے۔ مسمی کی شان یہ ہے۔

لَمۡ یَلِدۡ وَلَمۡ یُولَدۡ (سورۃ اخلاص:۳)

ترجمہ: نہ اس کی کوئی اولاد اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا۔

لفظ اللہ کی تحقیق میں آٹھ اقوال:

اکثر محققین کا خیال یہ ہے کہ مشتق ہے۔ پھر اس کے ماخذِ اشتقاق کے بارے میں آٹھ اقوال ہیں۔

پہلا قول: یہ "الہ یا لہ" سے مشتق ہے۔ جس کا معنی ہے عبادت کرنا۔ اس اعتبار سے اسے "اللہ" اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہی عبادت کا مستحق ہے۔ اسی کی عبادت کی جاتی ہے تو الہ "مالوہ" کے معنی میں ہو گیا۔ جیسا کہ امام "مؤتم" کے معنی میں ہوتا ہے۔

دوسرا قول: "الہ یا لہ" سے بنا ہے اور اس کا معنی ہے حیرت زدہ رہ جانا اور حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے مالک کے بارے میں جتنا زیادہ غور و فکر کرتا ہے اس کے تحیر اور استعجاب میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ ہماری تو حقیقت ہی کیا ہے، جنہیں ہم اہم معرفت کہتے ہیں وہ برسوں کے مشاہدہ مراقبہ اور غور و فکر کے بعد پکار اٹھے۔ "ماعرفنالت حق معرفتک" انسان نے اپنی ناقص عقل سے اسے پہچانا مگر نہ پہچان سکا۔

علامہ اقبال نے اسی لئے تو کہا:

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور ہے۔
چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے۔

شیخ سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہی خوب کہا ہے:

اے برتر از خیال وقیاس وگمان ووہم
وزہرچہ گفتہ اندہ خواندہ ایم شنیدہ ایم
وگر تمام گشت بہ پایاں رسید عمر
ما ہمچنان در اول وصف تو ماندہ ایم

اور ایک بہت پیار شعر ہے:

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا
میں جان گیا تیری پہچان یہی ہے

تیسرا قول: یہ "**الو له**" سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی ہے عقل کا گم ہو جانا۔ عقل اپنی تمام تر سر گردانی اور حیرانی کے باوجود اس ذاتِ مطلق کی حقیقت اور کنہ تک نہیں پہنچ سکی اور عقل بیچاری بھی کیا، عقل کو تو خود اپنی عقل نہیں، تولے اور ماشے کے لیے بنائے گئے ترازو سے منوں اور ٹنوں کا وزن نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن یہ بات عقل میں رہے کہ رب کی ذات ماوراء عقل تو ہے خلافِ عقل ہر گز نہیں اور ان دونوں باتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

چوتھا قول: "اَلِهَ" سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی ہے کسی کی طرف مضطر ہونا، پناہ پکڑنا، اس اعتبار سے "اللہ" اس لیے کہتے ہیں کہ ہر معاملہ میں اس کی طرف پناہ حاصل کی جاتی ہے۔

عرب شاعر کہتا ہے:

الھت الینا والحوادث جمۃ

توہماری طرف مضطر ہوا اس حال میں کہ حوادث کی کثرت ہے۔

پانچواں قول: "لَاہَ یَلُوْہ" سے مشتق ہے جس کا معنی ہے چھپ جانا اور اس کی تو شان ہی یہ ہے کہ یوں تو وہ ہر چیز میں ہے۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

ہر کہ بینم در جہاں غیرے تو نیست

یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو۔

لیکن ہماری ظاہری آنکھیں اسے دیکھ نہیں سکتیں۔

لَاتُدْرِکُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَيُدْرِکُ الْأَبْصَارَ (سورۃ الانعام:۱۰۳)۔

عربی کے ایک شاعر نے شاید اسی آیت کا ترجمہ کیا ہے:

لاہ ربی عن الخلق طرا خالق الخلق لایری ویرانا۔

(میرا رب ساری مخلوق کی نظروں سے مخفی ہے۔ وہ مخلوق کا خالق خود تو دکھائی نہیں دیتا لیکن ہمیں دیکھتا ہے)۔

چھٹا قول: "اَلَهَ" سے مشتق ہے جس کا معنی ہے سکون حاصل ہونا اور اس میں شک ہی کیا ہے کہ مضطرب روحوں کو اسی سے سکون ملتا ہے، ٹوٹے ہوئے دل اس کی یاد سے جڑتے ہیں۔ دلوں کی ویرانیاں اسی کے نام سے آباد ہوتی ہیں۔ حزن وملال کے اندھیروں میں اسی کے نام سے روشنی پھیلتی ہے اسی لیے تو قرآن میں کہا گیا ہے:

أَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ (سورۃ الرعد:۲۸)

ترجمہ: سن لو اللہ کی یاد ہی میں دلوں کا چین ہے۔

ساتواں قول: لفظ اللہ "لاۃ" سے مشتق ہے جس کا معنی ہے بلند ہونا۔ تو ذات باری تعالیٰ کو اللہ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ بلند ہے۔ اتنا بلند کہ وہاں پستی کا امکان نہیں اور اس کی رفعت کے سامنے تمام رفعتیں ہیچ اور گرد ہین۔ اس کی ذات بھی بلند ہے اور صفات بھی، وہ عجز سے بلند ہے۔ ضعف واضمحلال سے بلند ہے، فقر اور محتاجی سے بلند ہے، بھوک وپیاس سے بلند ہے، نیند سے سستی بلند ہے، ہر نقص اور عیب سے بلند ہے۔ ہمارے وہم وگمان سے بلند ہے، اس کے وجود کے مقابلے میں سب کا وجود کالعدم اس کے علم کے مقابلے میں سب کا علم جہالت بہرہ پن، اس کی بصارت کے لیکن میرے جسم اور جان کے مالک! میں تجھ پر ہزار بار قربان! تو نے اپنے نبی کی زبان سے یہ کہا کہلوا دیا۔

لا یستعنی ارضی و لا سمآئی و لٰکن یسعنی قلب عبدی المؤمن۔ (حدیث قدسی)

ترجمہ: (میں اتنا بلند اور اتنا عظیم ہوں) کہ زمین وآسمان کی وسعتوں میں نہیں سما سکتا لیکن اپنے مومن بندے کے دل میں سما جاتا ہوں۔

اسی لیے تو مجذوب صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کہا تھا:

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی

اب تو آ جاب تو خلوت ہو گئی

آٹھواں قول: "اَلَه" سے ماخوذ ہے۔ جس کا معنی ہے عطا کرنا تو ذات باری تعالیٰ کو اللہ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ عطا کرتا ہے۔ بلکہ صرف وہی عطا کرتا ہے اور کیا کچھ عطا نہیں کرتا۔ زندگی، جسم، ہاتھ، پاؤں، بصیرت، وبصارت، سماعت وحرکت، غور وفکر کی قوت اور صلاحیت، دل اور دل میں ایمان کا نور، دماغ اور دماغ میں فکر کا شعور۔ یہ سب کچھ اسی کا عطا کردہ ہے۔ اور رب کریم نے بجا فرمایا۔

وَاِنْ تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْھَا (سورۃ ابراھیم: ۳۴)۔

ترجمہ: اور اگر اللہ کی نعمتیں گنو تو شمار نہ کر سکو گے

اللہ تعالیٰ پر ایمان کی ضرورت واہمیت

رحمت کی تفسیر

قرآن مجید کا آغاز کرتے ہوئے سب سے قبل بندہ اللہ تعالیٰ کی ان دو صفتوں سے متعارف ہوتا ہے۔ ایک کا مفہوم جو دوست دشمن سب پر کرم کرنے والا ہو اور دوسرے کا مفہوم جو اپنوں کا خاص طور سے نوازنے والا ہو۔ عربی میں دونوں کا مادہ رائ حاء میم بنتا ہے۔ اول الذکر مبالغہ کا صیغہ ہے اور دوسرا صفت مشبہ کا۔۔۔۔۔ہے۔

لفظ رحمن اسم اللہ کے بعد خدا کا دوسرا بڑا نام ہے۔ اسی کو قرآن مجید میں فرمایا گیا۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ أَوِ ادْعُوا الرَّحْمَنَ أَيًّا مَا تَدْعُوا فَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى (سورۃ بنی اسرائیل: ۱۱۰)۔

ترجمہ: تم فرماؤ اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر جو کہہ کر پکارو سب اسی کے اچھے نام ہیں۔

علمی فائدہ: لفظ رحمان قرآن مجید میں ۹۹ مرتبہ آیا ہے۔

رحمت کے چار معانی:

مولانا اشرف علی تھانوی نے رحمت کی چار طرح سے تفسیر کی ہے۔

۱۔ توفیق اطاعت، عبادت و فرماں برداری:

اے اللہ رحمت کر دے۔ یعنی اطاعت وعبادت فرمان برداری کی توفیق دے دیجئے۔

۲۔ فراخی معیشت:

اے اللہ! رحمت کر دیجئے یعنی میری روزی میں برکت کر دیجئے۔

۳۔ بے حساب مغفرت کا فیصلہ:

اے اللہ رحمت کر دیجئے۔ یعنی بلا حساب مغفرت کر دیجئے۔

۴۔ دخول جنت:

اے اللہ رحمت کر دیجئے! یعنی اپنی جنت کا مستحق بنا دیجئے۔

بسم اللّٰہ کی نحوی تحقیق اور فعل کو حذف کرنے کی حکمتیں

یہاں ایک خاص بات قابل ذکر ہے کہ قرآنی عبارت میں ”شروع کرتا ہوں“ کے لیے کوئی لفظ یا کلمہ استعمال نہیں ہوا۔ ترجمے میں یہ الفاظ معنوی طور پر ادا کئے جاتے ہیں۔ حقیقت میں قرآن مجید کے اس انداز میں خاص حکمت پوشیدہ رکھی گئی ہے۔

اگر قرآن مجید ”شروع کرتا ہوں“ کے الفاظ اپنی عبارت میں استعمال کرتا تو اس کی صورت ہوتی ابداء، یا اشرع یا ابتدأ (میں آغاز کرتا ہوں) ان میں سے ہر لفظ فعل اور فاعل دونوں کا جامع ہوتا۔ عام طور پر یہی عربی اداب کا طریقہ اور قاعدہ ہے کہ فعل اور فاعل دونوں اکٹھے ملے ہوئے ہوا کرتے ہیں۔ اب اس کی دو ہی صورتیں ممکن تھیں۔

۱۔ ایک صورت یہ کہ ابداء وغیرہ کا لفظ بسم اللہ سے پہلے استعمال کیا جاتا۔

۲۔ دوسری صورت یہ کہ ایسا لفظ بسم اللہ کے بعد استعمال ہو تو لیکن قرآن نے اسے ہر صورت میں محذوف کر دیا۔

اس کی چند حکمتیں ہیں۔ ان حکمتوں کے بیان سے پہلے یہ اصول ذہن نشین ہو جانا چاہیے کہ بعض اوقات عربی عبارت میں ایسے حروف استعمال ہوتے ہیں جن سے پہلے کوئی فعل محذوف مانا جاتا ہے۔ یعنی اس کا شمار معنی میں تو ہوتا ہے لیکن عبارت میں نہیں ہوتا۔ مثلاً:

وَإِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلَائِکَةِ (سورۃ البقرۃ: ۳۰)۔

ترجمہ: اور یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا۔

یہاں قاعدہ نحو کے مطابق لفظ اذ سے پہلے "اذکر" فعل محذوف ہے جس کا معنیٰ ہے (یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا۔ اسی طرح حرف باء جس سے تسمیہ یعنی بسم اللہ الرحمن الرحیم کا آغاز ہورہاہے اس سے پہلے بھی ایک فعل محذوف ہے اس فعل کو محذوب رکھنے کی چند حکمتیں یہ ہیں جو کہ درجِ بالا ذیل ہیں۔

پہلی حکمت:

اگر اَبْدَءُ یا اس جیسا کوئی لفظ بسم اللہ سے پہلے آتا تو یہ بات واضح تھی کہ اس کا فاعل وہ شخص خود ہی ہوتا۔ جو قرآن کی تلاوت یا کسی دوسرے کام کا آغاز کررہا تھا۔ کا عمل اللہ تعالیٰ کسی لحاظ سے بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ چونکہ تعلیم یہ دینا چاہتے تھے کہ قرآن پاک کی تلاوت ہو یا کوئی اور دینی یا دنیاوی جائز کام ہو، اس کا آغاز اللہ تعالیٰ کے نام یعنی (بسم اللہ الرحمن الرحیم) سے ہی ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس مخصوص ادب معاشرت کی تعلیم کلمات بسم اللہ کے ذریعے دی جارہی تھی۔ اس لیے یہ ہرگز مناسب نہیں تھا کہ خود ان ہی کلمات کا آغاز اللہ تعالیٰ کے نام کے علاوہ کسی دوسرے کے ذکر سے ہوتا۔ چنانچہ اس مخصوص ادب اور ظابطہ عمل کی تعلیم بھی اسی انداز سے دی گئی کہ اظہار مدعا کا آغاز بھی براہ راست اللہ ہی کے ذکر سے ہو کسی اور کے ذخر سے نہ ہو کیونکہ اسی طرح کامل طریقے برکت کا حاصل ہونا ممکن ہے۔

دوسری حکمت:

واحد متکلم کا صیغہ متکلم کا صیغہ اگر استعمال ہوتا،، دونوں صورتوں میں قائل اپنا اور اپنے فعل کا ذکر اسم باری تعالیٰ پر مقدم کرتا۔ یہ امر ادب واحترام کی اعلیٰ منازل کے خلاف تھا۔ یہ لحاظ عام گفتگو میں بھی رکھا جاتا ہے کہ اگر قائل کسی کام کے ضمن میں اپنے علاوہ دوسرے افراد کا ذکر بھی مشترکہ طور

پر کرنا چاہتا تو پہلے دوسروں کا نام لیا جاتا ہے اور آخر میں متکلم اپنا نام لیتا ہے۔ کیونکہ اپنا نام پہلے لینا لطافت کے معیار کے خلاف ہے۔ اسی طرح کسی کام میں اعلیٰ پر ادنیٰ کی سبقت بھی خلاف ادب تصور کی جاتی ہے۔ اس کی ایک مثال قرآن حکیم سے بیان کی جاتی ہے کہ بعض لوگوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم سے پہلے قربانی کر دی اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (سورۃالحجرات: ۱)۔

ترجمہ: اے ایمان والو اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو اور اللہ سے ڈرو بے شک اللہ سُنتا جانتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے باوجود اس کے کہ ان کا یہ قربانی والا کام اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری پر مشتمل تھا اور وہ خون بھی محض اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر بہایا گیا تھا جو کہ خالصۃً عبادت تھا۔ لیکن ان سے غلطی صرف یہ سرزد ہوئی کہ وہ عمل میں وقتی طور پر بنی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم کی تعظیم وادب کے منافی معلوم ہوئی۔ انہیں قربانیاں دوبارہ کرنے کا حکم دیا گیا اور آئندہ کے لئے حکماً اس پہل کے امکان کو بھی ختم کر دیا گیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما سے تھے اور اس طرح وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم پر تقدم کر بیٹھتے تھے۔ چنانچہ اس آیت کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ان کو حکماً منع فرمادیا۔ اس مثال کے ذریعے حقیقت میں یہ بات واضع کرنا مقصود تھی کہ بعض کام میں اوقاتے پہل کرنا خلاف ادب تصور کیا جاتا ہے۔ چنانچہ بسم اللہ میں جو کہ خود ہی سراسر ادب کی تعلیم ہے، اسی اصول کو لفظاً بھی سامنے رکھا گیا ہے، تاکہ کلام میں بھی ادب الوہیت نظر انداز نہ ہو۔ کیونکہ یہی کمال ایمان کی علامت ہے۔ ادب سے محرومن شخص علم وعمل کی بے پناہ

دولتوں کے باجود لذت ایمان سے محروم رہتا ہے۔اسی لئے ادب ہر سطح پر جس قدر بھی ملحوظ رہے بہتر ہے۔کلام میں اس قدر لفظی احتیاط اور حکمت و مصلحت انسانی کوشش کے باوجود پیش نظر نہیں رہ سکتی۔یہ صرف اللہ تعالیٰ کے کلام کا معجزہ ہے جو بغیر تصنع کے ان حکمتوں پر دلالت کر رہا ہے۔

تیسری حکمت:

یہ حکمتیں تو لفظ اَبۡدَءُ وغیرہ کے الفاظ کو بسم اللہ پر مقدم نہ کرنے میں پوشیدہ تھیں۔اب سوال یہ پیدا کرتا ہے کہ اللہ کے نام سے پہلے کسی اور کا ذکر تو خلاف ادب تھا۔اس لئے اسے محذوب رکھا گیا۔مگر بعد میں بیان نہ کرنے میں کیا مصلحت پوشیدہ ہے۔یہ بات ذہب نشین رہے کہ صاحب حکمت کا کوئی فعل عمل حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔صاف ظاہر ہے کہ اَبۡدَ اَ یا اقۡرَاء ایسے الفاظ کسی نہ کسی کام کے شروع کرنے کا ذکر آئے گا تو اس میں فاعل خود متکلم کی ذات ہو گی۔

گویا متکلم بسم اللہ کے ذریعے کسی نہ کسی فعل میں اپنے فاعل ہونے کا ذکر بھی ساتھ ہی کر رہا ہو گا کہ "اللہ کے نام سے میں (فلاں کام) شروع کرتا ہوں۔"اسی طرح فعل کی نسبت متکلم کی طرف ہو جاتی ہے اور اس کا فاعل ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔یہاں مصلحت یہ تھی کہ انسان خود کو باری تعالیٰ کے لطف و کرم کا اس حد تک محتاج و فقیر سمجھ کے تمام کاموں کی نسبت اسی ذات کاملہ کی طرف کر دے۔ہر چند کہ افعال کا صدور و قوع انسان ہی سے ہوتا ہے لیکن ہر فعل کے صادر کرنے کی قوت وہمت اور طاقت وصلاحیت انسان کو بارگاہ رب ذوالجلال سے ہی نصیب ہوتی ہے کیونکہ تمام قوتوں اور طاقتوں کا سرچشمہ تو صرف وہی ذات ہے۔اس کے بعد متکلم کا اپنا فاعل ہونا بیان کرنا اللہ تعالیٰ کی شان الوہیت کے منافی تھا۔گویا یہ تعلیم دی گئی کہ اے انسان ہر کام شروع کرتے ہوئے خدا کا نام لے اور اس کام کی توفیق کی نسبت بھی اسی ذات کی طرف، کبھی بھی اس فعل کو اپنا کمال نہ سمجھ کیونکہ

فاعل حقیقی تو نہیں اللہ کی ذات ہے۔ یہاں انسانی فکر کو کبر و نخوت کی تباہ کاریوں اور نقصانات سے بچنے کی صورت بتائی گئی ہے کہ اگر انسان زبان سے ذات حق جل جلالہ کا نام لے کر دل میں یقین بھی اس کی طاقت کی کار فرمائی پر رکھے گا تو سوچ کا یہ انداز سے کبھی بھٹکنے اور گمراہ ہونے نہ دے گا۔ یہ فکر ایمانی آداب کا لازمہ ہے۔ سورہ النساء مین اسی کی تلقین کی گئی ہے۔

قُلْ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ فَمَالِ هٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ حَدِيثًا (سورۃالنساء:۷۸)۔

ترجمہ: تم فرمادو سب اللہ کی طرف سے ہے تو ان لوگوں کو کیا ہوا کوئی بات سمجھتے معلوم ہی نہیں ہوتے۔

یہاں صرف جائز کاموں میں توفیق کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہونا مذکور ہے۔ اسی اندازِ سخت کی تلقین تسمیہ کے ذریعے کی جارہی ہے۔ یہاں ایک اور لطیفہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ بسم اللہ میں چونکہ ذکر صرف اللہ تعالیٰ کا ہے اور ابتدا فعل کی نسبت انسان کی طرف ذکر نہیں کی گئی ہے۔ اس لئے حکم ہے کہ بسم اللہ محض جائز کاموں کے آغاز میں پڑھی جائے۔ خلافِ شرع امور پر نہیں۔ کیونکہ غلط کاموں میں توفیق فعل کی نسبت باری تعالیٰ کی طرف کرنا آداب بندگی کے خلاف ہے ۔بندے کو یہ زیب نہیں دیتا ہے کہ وہ اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کو آنے آقا کی طرف منسوب کرتا پھرے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

مَا أَصَابَکَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَا أَصَابَکَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِکَ (سورۃالنساء: ۷۹)۔

ترجمہ: اے سننے والے تجھے جو بھلائی پہنچے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو برائی پہنچے وہ تیری اپنی طرف سے ہے۔

مذکورہ بالا دو آیات میں حقیقت حال بھی واضح کردی گئی ہے اور فکر و قول کے آداب بھی، کہ

توفیق اور طاقت ہر کام کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصیب ہوتی ہے۔لیک نیکی صادرر ہو تو بندگی یہ ہے کہ انسان اسے اپنے آقا کی رحمت سمجھ کر اسی کی طرف منسوب کر دے اور برائی صادر ہو تو اسے اپنی بری کاوش کا نتیجہ سمجھے ۔حیققت یہ ہے کہ اسی انداز فکر سے انسان کی اپنے عیبوں اور کاتاہیوں پر نظر رہتی ہے۔اور وہ خود تنقیدی احتساب کے ذریعے اپنی اصلاح کا طالب ہو سکتا ہے اور دوسری طرف وہ بعض اچھا کو محض اپنی صلاحیت کا ثمرہ سمجھ کر پیکر رعونت بھی نہیں بننے پاتا بلکہ فتواضع رہتا ہے۔چونکہ ہر کام کی توفیق اور ہمت وقدرت کا منبع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔اس لئے تسمیہ میں صرف اس کے مجرد ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے اور انسان کے فعل یا س کے فاعل ہونے کا ذکر محذوف کر دیا گیا۔گویا حقیقت کو عیاں کر دیا اور جو کچھ محض ظاہر تھا اسے پوشیدہ کر دیا۔

آیت الحمد سے استدلال:

سورۃالفاتحہ کا آغاز بھی اسے فلسفے کی نشاندہی کرتا ہے۔ارشاد فرمایا گیا ہے:

الْحَمْدُلِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِینَ (سورۃالفاتحہ: ۱)۔

ترجمہ: سب خوبیاں اللہ کو جو مالک سارے جہان والوں کا۔

یہ بات بڑی واضح ہے کہ جب کسی کی خوبی یا تعریف ہو گی تو یقیناً پیچھے کوئی نہ کوئی تعریف کرنے والا بھی ہو گا۔کیونکہ زبانِ حمد کھولے بغیر بیانِ حمد نہیں ہو سکتا۔لیکن یہاں حمد کا ذکر ہے، حامد یا فعلِ حمد کا بیان نہیں ہے۔نکتہ کیاہے وہ نکتہ یہ ہے کہ اگر حمد کرنے والے کا ذکر کر دیا جاتا تو ممکن ہے وہ یہ سمجھتا کہ محمود میری حمد کا محتاج ہے یا میری تحمید نے اسے عظمت دی ہے۔حالانکہ حمد کسی کا کارنامہ نہیں۔یہ حسن الوہیت کا اپنا استحقاق ہے۔لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اپنا محمود ہونا بیان کر دیا۔مگر کسی کا حامد ہونا صراحت سے بیان اور ظاہر نہیں کیا۔اسی طرح تسمیہ میں فعل اور فاعل کو محذوف رکھنے میں حکمت یہ تھی کہ یقیناً وہ کام جس کے آغاز میں بسم اللہ پڑھی جارہی ہے وہ تو کوئی نہ کوئی شخص ہی

کرے گا لیکن کہیں وہ اپنی فاعلیت پر ایسا گمان نہ کرنے لگے کے یہ کام میں اپنی ہمت وتوفیق سے کررہا ہوں مبادا نگاہ اپنی ذات پر مرکوز ہو جائے۔ چنانچہ خدا کا نام محض برکت کی غرض سے نہیں بلکہ اس اعتماد سے لیا جائے کہ اس کام کی توفیق بھی محض اللہ تعالیٰ کی عطا سے ہے اور مجھ پر اس کا کرم ہے ورنہ میں اس قابل کہاں۔

چوتھی حکمت:

اولاً یا آخراً کسی صورت میں بھی خدا کے ماسوا کے ذکر کلمات بسم اللہ میں نہ ہوتا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ واجب الوجود صرف اسی کی ذات ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ ممکن ہے۔ بسم اللہ چونکہ تمام معارف قرآنی کا خلاصہ ہے اس لئے اس کا انداز بیان بھی ایسا اختیار کیا گیا ہے۔ دین حق کے جملہ مقاصد و مطالب کا خلاصہ ہو گا۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم کا آغاز وانجام صرف خدا ہی کی ذات وصفات کے ذکر پر مبنی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں نہ کسی فعل کا بیان ہے نہ کسی فاعل کا۔ گویا یہ الفاظ خدا کی وحدانیت کو اسی طرح اجاگر کر رہے ہیں کہ اس کائنات میں اس کے بغیر نہ تو کسی فعل کا صدور ممکن ہے اور نہ کسی فاعل کو وجود۔ بلکہ دوام حقیق اور ثبات ابدی اگر کسی ذات کو حاصل ہے تو وہ صرف خالق عالم ہی کی ذات ہے۔ وہی اول اور وہی آخر بھی ہو گا۔ اس لئے نہ اس سے پہلے کسی فعل کا ذکر ممکن ہے اور نہ اس کے بعد ارشاد ربانی ہے۔

هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (سورۃ الحدید: ۳)۔

ترجمہ: وہی اوّل وہی آخر وہی ظاہر وہی باطن اور وہی سب کچھ جانتا ہے۔

وہی پوشیدہ ہے اور وہ ہر شے کو جاننے والا ہے۔

لِلَّهِ الْأَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ (سورۃ الروم: ۴)۔

ترجمہ: حکم اللہ ہی کا ہے آگے اور پیچھے۔

لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ(سورۃالقصص:۸۸)۔

ترجمہ:اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہر چیز فانی ہے سوا اس کی ذات کے اسی کا حکم ہے۔

چنانچہ بسم اللہ کے کلمات میں خدا کے علاوہ ہر قسم کے فعل اور فاعل کے ذکر کا محذوف ہونا انسان کو پوری کائنات اور اس کے نظام کے ختم ہوجانے ت اور اس کی بے ثباتی کی یاد دلاتا ہے۔ یہ کلام پکار پکار کر دنیا کی بے حیقیقت رنگینیوں میں ڈوبے ہوئے انسانوں کو حقیقت ابدی کی طرف متوجہ کردیاہے تاکہ لوگ خواب غفلت سے بیدار ہوکر بلاچوں وچراا سی حکم الحاکمین کی قدرتوں اور قوتوں پر کامل ایمان لے آئیں اور اس دنیا کی زندگی کو جو کہ دھوکہ ہے کو ہی آخری منزل نہ سمجھ لیں۔ بسم اللہ سے چونکہ قرآن کا آغاز ہورہاہے اس موقع پر جامع ومانع انداز سے خدا کی ہستی اور اس کی صفات کا ذکر اوراس کے ماسوا کا حذف انسان کو یہ تعلیم دیتاہے کہ وہ دل ودماغ سے غیر کا خیال نکال دے اور ہر لحہ ذات حق جل وعلا پر نظر رکھے۔ یہ معراج عہدیت ہے اور قرآن کا پہلا سبق بھی یہی ہے جیساہ ارشادباری تعالیٰ ہے:

وَلِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ۔
(سورۃالبقرۃ:۱۱۵)

ترجمہ: اور پورب پچھم (مشرق ومغرب) سب اللہ ہی کا ہے تو تم جدھر منہ کرو ادھر وَجۡہُ اللّٰہ (خدا کی رحمت تمہاری طرف متوجہ) ہے بے شک اللہ وسعت والا علم والا ہے۔

اس کے علاوہ ایسا موجود حقیق ہے کہ ہر وجود کو پیدا کرنے ولای ذات بھی وہی ہے اور ہر وجود نے لوٹنا بھی اسی کی طرف ہے۔ بلکہ دوسرے لفظوں میں ہر وجود کائنات کا جواز بھی اسی کے وجود سے ہے۔وہ حقیقت ہے اور اس کے علاوہ ہر شیبھی اسی پر دلالت کرتی ہے۔اس لئے تسمیہ میں حقیقت کا ذکر کیا گیاہے اور مجاز کو ترک کردیا گیا۔

حرف باء کی افادیت واہمیت

کلمات تسمیہ کا پہلا حرف ''باء'' ہے۔ جس کا معنی ''سے'' ہے۔یہ فعل مخذاف سے متعلق ہے محذوف سے مرد وہ فعل اور فاعل ہے جس کا ذکر یہاں لفظاً نہیں بلکہ معناً موجود ہے۔یعنی ''میں شروع کرتاہوں اللہ کے نام سے'' گویا حرف باء فعل محذوف کو اللہ کے نام سے ملانے کے لئے استعمال ہوا ہے۔''بائ'' کی اپنی استعمال و افادیت کے لحاظ سے متعدد اقسام ہیں۔ جنہیں علماء نحو نے شرح وبسط کے ساتھ بیان کیاہے۔ لیکن یہاں یہ حرف ان میں تین اقسام پر مشتمل ہو سکتاہے۔۱۔ بائے الصاق و مصاحت ۲۔بائے استعانت ۳۔بائے تیمن و تبرک۔

بائے مصاحبت:

الصاق و مصاحبت کا معنی اکٹھاہونا، متصل ہونااور فاقت ومعیت اختیار کرناہے۔اس صورت میں جب کہ لفظ ''با'' کو مصاںحت کے لئے قرار دیا جائے تو تسمیہ کا مفہوم یہ ہو گا کہ میں اللہ کے نام کو اپنا ساتھی بناتے ہوئے اس کے دامن رحمت سے وابستہ اور منسلک ہوتے ہوئے اور محض اسی کی رفاقت ومعیت پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے کام کا آغاز کرتاہوں۔امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ اس مقام پر فرماتے ہیں۔

وهذاالباءباءالإلصاق فهويلصق العبدبالرب، فهو كمال المقصود۔[19]

یہ باء بائے الصاق ہے۔چنانچہ یہ بندے کورب سے ملاتی ہے اوریہی انسانی مقصود کا کمال ہے۔

حرف باء کے اس مفہوم کی افادیت یہ ہے کہ تسمیہ کے ذریعے انسان کو اپنے ہر کام کے آغاز سے انجام تک خدا کی معیت کا احساس رہے۔ یہ امر واقع ہے کہ اگر انسان کو کسی نہایت قوی، مضبوط اور ہمدرد بہی خواہ ساتھی کی رفاقت کا احساس ہو تو اسے کسی سطح پر بھی خوف وخطر دامن

---

[19]تفسیر الفخر الرازی، ج ا ص ۹۹۔

گیر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ انسان کو کارگہ زیست میں ہر خوف و غم سے بے نیاز کرنے کے لئے بسم اللہ کے ذریعے دل و دماغ میں یہ احساس پیدا کیا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کروگے تو اس کی معیت بھی تمہیں حاصل ہو گی۔ جس کی حفاظت کے باعث تمہیں نہ کوئی نقصان پہنچ سکے گا اور نہ تمہاری کاوشیں بے نتیجہ ہوں گی۔اسی تصور کو قرآن یوں بیان کرتا ہے۔

وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (الحدید ۴)

اور وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں بھی ہو اور اللہ تمہارے کام دیکھ رہا ہے۔

اسی طرح ہجرت والی رات صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو غارِ ثور میں تنہائی کے احساس سے کچھ خدشہ سا محسوس ہوا کہ شاید کفار مکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم کے تعاقب میں تھے انہیں نقصان پہنچادیں۔اس پر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم نے ان سے بزبانِ وحی ارشاد فرمایا:

لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا فَأَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ۔ (التوبة ۴۰)

پریشان نہ ہو بے شک اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی تسکین نازل فرمادی۔

اس ارشاد پر غور کریں تو اندازہ ہو گا کہ اخدا کی معیت پر ایمان تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا پہلے ل سے ہی تھا ج۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس قدر مخالفت کے ماحول میں اپنے گھر والوں کو اکیلا چھوڑ کر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم کے شریکِ سفر نہ ہوتے۔ لیکن ظاہراً بے سرو سامانی کا عالم، تنہائی کا ماحول اور کفار و مشرکین کے تعاقب کا خیال وقتی طور پر غم اور پریشانی کا باعث بنا اور یہ انسانی طبیعت کا لازمی تقاضا تھا۔اس پر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ

وبارک وسلم نے صرف انہیں معیت خداوندی کی طرف متوجہ کردیا۔یہ احساس بحال ہوناتھاکہ دل کواطمینان کی دولت نصیب ہوگئی۔گویامعیت خداوندی قلبی تسکین کالازمی سبب ہے۔یہی تو فلسفہ تسمیہ ہے کہ انسان خداکی معیت کا احساس اجاگر کر کے جہد حیات کا آغاز کرے تو کوئی خوف اسے پریشان نہیں کرسکتا۔خوف وحزن سے نجات پاکر انسانی جدوجہد کو وہ تازگی اور قوت میسر آتی ہے ۔جس سے کامیابی کی منزل بھی آسان ہوجاتی ہے۔ورنہ بے یقینی اور مایوسی کی کیفیت تگ ودو کو مطلوبہ منزل تک نہیں پہنچنے دیتی۔

ارشادباری تعالیٰ ہے:

فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلْمِ وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ وَاللَّهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَتِرَكُمْ أَعْمَالَكُمْ(سورۃمحمد:۳۵)۔

ترجمہ:"توتم سُستی نہ کرواور آپ صلح کی طرف نہ بلاؤاور تم ہی غالب آؤگے اور اللہ تمہارے ساتھ ہے اور وہ ہرگز تمہارے اعمال میں تمہیں نقصان نہ دے گا"۔

تمہارے ساتھ ہے اور وہ ہرگز تمہارے کوششیں بے نتیجہ نہیں جانے دے گا۔

یہاں یہ امر ذہن نشین رہے کہ خداکی مددومعیت تودر حقیقت ہمہ وقت انسان کوحاصل ہوتی ہے۔لیکن اسے اس معیت (مدد) کااحساس نہیں ہوتا۔مددخداوندی کایقین نہ ہونے کی بناپر وہ اسکے تمام فوائد کوحاصل نہیں کرسکتا۔بسم اللہ الرحمن الرحیم مددِ خداوندی حاصل کرنے کے لئے نہیں بلکہ اس کاشعور بیدار کرنے کے لیے ہے۔

ارشادباری تعالیٰ ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ(سورۃ ق:۱۶)۔

ترجمہ: اور بے شک ہم نے آدمی کو پیدا کیا اور ہم جانتے ہیں جو وسوسہ اس کا نفس ڈالتا ہے اور ہم دل کی رگ سے بھی اس سے زیادہ نزدیک ہیں۔

اس آیت سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی کہ معیت الٰہی تو انسان کو پہلے سے ہی میسر ہوتی ہے۔ لیکن اس کا شعور بیدار نہیں ہوتا۔ جب اس معیت خداوندی کا شعور انسان کے اندر ایک زندہ قوت بن جاتا ہے تو تمام وساوس نفسانی اور دنیوی خطرات نیست ونابود ہو جاتے ہیں اور قلب پر اس احساس کے محیط ہو جانے سے ایک عجیب لطف وسکون اور لذت واطمینانی کی مستقل کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ انسان کو پھر کسی اور کی رفاقت کی طلب نہیں رہتی ہے۔

وہ عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذت آشنائی

لیکن اس لطف کا اندازہ بیان سے نہیں بلکہ دھیان سے ہی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ لذت بتانے کی نہیں محسوس کرنے کی چیز ہوتی ہے۔

بائے استعانت:

استعانت سے مراد مدد طلب کرنا ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے بسم اللہ الرحمن الرحیم کا مفہوم یہ ہو گا کہ ”اللہ کے نام سے مدد طلب کرتے ہوئے شروع کرتا ہوں“۔

حضرت نوح علیہ السلام نے قیامت خیز طوفان سے اپنے پیروکاروں کو بچانے کے لیے حکم الٰہی سے ایک کشتی بنائی اور انہیں اس میں سوار ہو جانے کو کہا۔ قرآن حکیم اس کا تذکرہ اس طرح کرتا ہے:

وَقَالَ ارْكَبُوا فِيهَا بِسْمِ اللَّهِ مَجْرَاهَا وَمُرْسَاهَا إِنَّ رَبِّي لَغَفُورٌ رَحِيمٌ (سورۃ ھود: ۴۱)۔

ترجمہ: اور بولا اس میں سوار ہو اللہ کے نام پر اس کا چلنا اور اس کا ٹھہرنا بے شک میرا رب ضرور بخشنے والا مہربان ہے۔

گویا اس آیت کے ذریعے جملہ مہمات میں خدائے رحمان اور رحیم کے نام سے استعانت کی تعلیم دی جارہی ہے تاکہ انسان پر یہ حقیقت واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ کی مدد اعانت کے بغیر نہ تو کسی خیر کو حاصل کیا جاسکتا ہیاورنہ کسی شر سے محفوظ ہوا جاسکتا ہے۔ چونکہ فعل محذوف کے اعتبار سے یہاں کام کے شروع کرنے کا ذکر ہورہا ہے۔ اس لئے بائے استعانت کا معنوی اطلاق یوں ہوگا کہ "اے اللہ میں ہر کام کے شروع کرنے میں بھی تیری مدد کا محتاج ہوں" جب کوئی کام خدا کی توفیق کے بغیر آغاز پذیر ہی نہیں ہوسکتا تو اس کا ختم ہونا کیسے ممکن ہوگا۔ دراصل یہاں انسان کو اپنی حاجت مندی کا احساس دلایا جارہاہے تاکہ وہ دینوی متاع کو کثرت کے ساتھ حاصل کرکے اپنے اللہ کے حضور سر نیاز خم کرنے سے باغی نہ ہوجائے۔ انسان کے ذہن میں یہ حقیقت ہر وقت موجود رہے کہ میں رب ذوالجلال کی عنایت کے بغیر اپنی جہدِ حیات میں پہلا قدم بھی نہیں اٹھاسکتا کس قدر احسان فراموش ہے وہ شخص جس کا قدم بھی خدا کے لطف وانعام سے اٹھے لیکن وہ بجائے اس کی اطاعت کے اسی کے احکام کی خلاف ورزی کے لئے بڑھ رہاہو۔ اگر انسان کی آنکھوں کو قوت دید، اس کے دست وبازو کو قوت عمل، اس کے قدموں کو قوت نقل وحرکت اور اس کے دماغ کو قوت فکر الغرض سب کچھ خدا کی مدد اعانت کے سبب میسر آیاہے تو اس کے ظاہری اور باطنی اعضاء جوارح میں سے کوئی عضو بھی رضائے الٰہی کے خلاف حرکت میں نہ آئے۔ ہم سے جو گناہ سرزد ہوتے ہیں اور ہمارے فکر میں جو سرکشی جنم لیتی ہے یہ دراصل اسی شعور کے فقدان کا نتیجہ ہے۔

تسمیہ فی الحقیقت انسان کی فکری و عملی اصلاح کا شاندار ذریعہ ہے۔ اگر ہر کام شروع کرنے سے پہلے زبان اور دل خدا کا نام لینے اور اس سے مدد طلب کرنے کی طرف راغب ہوں اور یہ ان کی عادی خصوصیت بن جائے تو نواہی و محرکات سے از خود پرہیز ہونے لگے گا۔ کیونکہ خدا کی یاد کے ہوتے ہوئے حکم، خدا کی خلاف ورزی ممکن نہیں رہتی۔

مزید بر آں استعانت دعا ہے اور دعا خود مغز عبادت۔ اس لحاظ سے تسمیہ فی نفسہ عبادت کی روح قرار پاتا ہے۔ اس کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان خود کو کسی کام کے کرسکنے میں اپنے اسباب ووسائل کے باوجود اپنے آپ کو ناکافی وعاجز تصور کرتا ہے اور پھر اپنی بے بسی کے اعتراف کے ساتھ خدائے بزرگ وبرتر کی مناجات کرتے ہوئے اس سے مدد طلب کرتا ہے۔

گویا انسان اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سوالی بن کر حاضر ہے۔ وہ دنیا ومافیہا سے ناامید اور تما اسباب سے مایوس ہوکر مسبب الاسباب کی بارگاہ میں نیاز مندی کے ساتھ آن کھڑا ہوا ہے۔ اس کی آرزو مندی دل کو درد وسوز کی لذت سے آشنا کر دیتی ہے اور یہی کیفیت انسان کو مقام بندگی سے ہمکنار کرتی ہے۔ بقول شخصے

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا مجھ کو
وگرنہ میں خدا ہوتا جو دل بے مدعا ہوتا

اسی مقام کو علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ یوں بیان کرتے ہیں:

متاع بے بہا ہے درد وسوز وآرزو مندی
مقام بندگی دے کرنہ لوں شان خداوندی

قرآن میں حرف باء کا استعمال کتنے ہی مقامات پر اسی مقصد کے لیے ہوا ہے۔ ارشادِ خداوندی

ہے۔

یَاأَيُّهَاالَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلاَةِإِنَّ اللّهَمَعَ الصَّابِرِينَ (سورۃالبقرۃ:۱۵۳)۔

ترجمہ:اے ایمان والو صبر اور نماز سے مدد چاہو بیشک اللہ صابروں کے ساتھ ہے۔

یہاں صبر اور نماز دونوں کو استعانت کے ذریعہ طور پر بیان کیا گیا ہے کہ استعانت تو لامحالہ باری تعالیٰ سے ہوگی، لیکن اس کے کامل استحقاق کے لئے صبر و نماز کو اپنالو تاکہ ان کے واسطے سے اللہ تعالیٰ کا لطف وکرم اور عنایت واعانت زیادہ سے زیادہ نصیب ہوسکے۔اسی تصور خیال کو ایک اور مقام پر یوں واضح کیا گیا ہے۔

قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ اسْتَعِينُوا بِاللّهِ وَاصْبِرُوا (سورۃالاعراف:۱۲۸)۔

ترجمہ: موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا اللہ کی مدد چاہو اور صبر کرو۔

اسباب سے صرف نظر کر کے مسبب الاسباب پر نظر رکھنا ہی صبر کہلاتا ہے۔اس لئے قرآن استعانت کے ساتھ توحید مطلق کی بھی تعلیم دے رہاہے۔تسمیہ میں بائے استعانت سے پہلے یا بعد میں کسی اور کا ذکر نہیں۔صرف خدا ہی کے نام پر اکتفا کیا گیا ہے۔جس کا واضح مقصد یہی ہے کہ انسان کی تمام ضروریات ومشکلات میں خدا ہی کی ذات کافی ہے۔اسے کسی اور چیز پر توکل کی ضرورت نہیں۔

بائے تبرک:

تبرک کے معنی برکت حاصل کرنا ہے۔لہٰذا بائے تبرک کے حوالے سے تسمیہ کا معنی یہ ہوگا کہ "اللہ کے نام سے برکت حاصل کرتے ہوئے شروع کرتا ہوں" خدا کے نام سے شروع کرنا اس اعتبار سے باعث برکت ہے کہ اس کام کے پایۂ تکمیل تک پہنچنے کے امکانات زیادہ روش اور واضح ہوجاتے ہیں۔وجہ یہ ہے کہ وسائل کو مہیا کرنا بھی تو اسی کا کام ہے۔اس لیے جب اس ذات کے

مقدس نام سے برکت طلب کی جائے تو وہ ذات اس کام کا انجام تک پہنچنا سہل اور آسان کر دیتی ہے ۔اس لیے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم نے فرمایا۔

(كل أمر ذي بال لا يبدأ فيه بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ..فهو أقطع)[20]

ترجمہ: ”جو کام بسم اللہ پڑھے بغیر شروع کیا جائے وہ ناتمام اور ناقص رہ جاتا ہے۔ کیسی پیاری تعلیم ہے اسلام اور پیغمبر اسلام کی“۔

عجائباتِ تسمیہ
بسم اللہ کے اسرار ومعجزات

اللہ، الرحمٰن، الرحیم، تین اسماء کی خصوصیات

شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

بسملة الاسماء ذو منظرين — مابين ابقاء افناء غين
الا بمن قالت لمن حين ما — خافت على النمل من الحطمتين
فقال من اضحكه قولها — هل اثر يطلب من بعد عين
بانفس بانفس استقيمى فقد — عاينت من نملتنا القبضتين
وهكذا فى الحمد فاستثنها — ان شئت ان تنم بالجنتين
احدهما من عسجد مشرق — جملتها واختها من لجين
ياام قرآم العلى هل ترى — من جهة الفرقان للفرقتين
انت لنا السبع المثانى التى — خص بها سيدنا دون مين

[20] شرح سنن ابن ماجة المسمى «مرشد ذوي الحجا والحاجة إلى سنن ابن ماجه والقول المكتفى على سنن المصطفى الناشر: دار المنهاج، المملكة العربية السعودية—جدة ج ١ ص ٤٩

فانت مفتاح الهدى للنهى   وخص من عاداک بالفرقتين

"وجود کی فنا اور بقاء کے درمیان بسم اللہ کے اسماء کے منظر ہیں۔ خبر دار! یہ معاملہ اس چیونٹی کی طرح نہیں ہے جس نے روندے جانے کے خوف سے بلوں میں گھس جانے کی ندا کی تھی۔ پس فرمایا: چیونٹی کے کلام کو سن کر حضرت سلیمان مسکرائے، پس بتاؤ کیا وجود کے بعد طلب کا نشان کبھی باقی رہا ہے؟ اے نفس! اے نفس! پس قائم ہو جا، تحقیق تو ہماری چیونٹی سے دو مٹھیاں دیکھ چکا ہے۔ اگر تو دو جنتوں کے انعامات حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسی طرح اللہ تعالیٰ کی حمد کے لیے خاص ہو جا۔ ان میں سے ایک جنت چمکیلے سونے کی اور دوسری چاندی کی ہے۔ اے عالی شان قرآن کی اصل! کیا تو فرقان کی جہت سے دو فرقوں کو ملاحظہ کرتی ہے۔ تو ہمارے لیے وہ وسبع مثانی (بار بار پڑھی جانے والی سات آیات) ہے جسکے ساتھ ہمارا سردار خاص ہے، اور اس میں کوئی جھوٹ نہیں۔ پس تو منکرین کے لئے ہدایت کی چابی ہے اور تیرا دشمن دونوں کے فرق سے مخصوص ہے"۔

ہم ارادہ رکھتے ہیں کہ معرفت وجود اور ابتدائے عالم کا ذکر شروع کریں اور ہمارے نزدیک ایسا بڑا مصحف ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ نے ہمیں "حال" سے پڑھ کر سنایا ہے، جیسا کہ ہمارے نزدیک تلاوت "قال" سے ہوتی ہے۔

منتشر وجود کے اوراق پر مخطوط و مرقوم حروف ہی عالم ہے، جس میں ہمیشہ کتابت ہوتی رہے گی اور کبھی بھی اس معاملے کیا انتہا نہیں ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی غلبے والی کتاب کی ابتداء فاتحۃ الکتاب سے کی ہے اور یہ کتاب وہ عالم ہے جس پر ہم گفتگو کریں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ سورۃ الفاتحہ کے اسرار سے کلام کا آغاز کریں۔ تسمیہ یعنی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سورۃ الفاتحہ کی بھی فاتحہ (ابتداء) ہے اور سورۃ الفاتحہ کی پہلی آیات یہی ہے۔ یہ فاتحہ کے لیے اتنی ہی ضروری ہے جتنی مکان کے لیے چوکھٹ۔ اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ یہ فاتحہ کا حصہ ہے یا نہیں۔ لیکن پھر بھی ضروری ہے

کہ بسم اللہ پر گفتگو کریں۔ اللہ تعالیٰ کے کلام سے برکت کے حصول کے لیے ویسے بھی ہم سورۃ البقرۃ کی دو یا تین آیات پر بھی گفتگو کریں گے۔ ان شاء اللہ اس کا ذکر آئندہ باب میں ہو گا۔

ہم بیان کر چکے کہ عالم کے وجود کا سبب اللہ تعالیٰ کے مبارک اسماء ہیں اور یہی اس عالم پر قابض اور مؤثر ہیں۔ ہمارے نزدیک بسم اللہ الرحمٰن الرحیم وہ خبر ہے کہ جس کی ابتداء پوشیدہ ہے، اور یہی ابتداء عالم کی ابتداء اور ظہور ہے۔

جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

(بسم اللہ الرحمٰن الرحیم)

"اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے شروع"

یہی عالم کا ظہور ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے یہ تین اسماء اللہ، الرحمٰن اور الرحیم عالم کے ظہور کے لیے خاص ہیں، یہی وجہ ہے کہ یہی اسماء حقائق کی بھی خبر دیتے ہیں۔

۱۔ "اللہ" یہ اسم تمام تر اسماء کا جامع ہے۔

۲۔ الرحمٰن، یہ عام صفت ہے، پس اللہ تعالیٰ اسی صفت سے دنیا و آخرت میں رحم فرماتا ہے۔ اس صفت کے ساتھ اس کا رحم ہر چیز پر دنیا میں ہوتا ہے جبکہ اس کا قبضہ محض سعادت کے ساتھ آخرت میں خاص ہو گا، کیونکہ یہ صفت وہاں اپنے قبیل سے منفرد ہو گی، جبکہ دنیا میں اس کے امتزاج کا ظہور ہے۔ ایک آدمی کافر پیدا ہوتا ہے اور مومن مرتا ہے، عالم شہادت میں وہ کافر ہوتا ہے اور کبھی مومن، پہلے کے بالکل برعکس، (اللہ کی صفتِ رحمٰن سے اسے دونوں حالتوں میں فائدہ ہوتا ہے) پس حدیث کے مطابق وہ (رحمٰن کے) دونوں قبضوں (جنتی یا جہنمی لوگوں) میں سے کسی ایک کے ساتھ خاص ہو جاتا ہے۔

۳۔ جہاں تک بات ہے "الرحیم" اسم کی تو یہ آخرت میں مومنوں کے ساتھ خاص ہو گا۔

عالم انہی تین اسماء کے ساتھ تمام ہو گیا، سب اسماء اجمالاً اسمِ اللہ میں پوشیدہ ہیں اور سب اسماء تفصیلاً الرحمٰن والرحیم دونوں اسماء میں پوشیدہ ہیں، جس کا ہم نے ذکر کیا ہے ہم اس کی تحقیق بیان کریں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہاں بسم اللہ اور سورۃ الفاتحہ میں موجود بعض اسرار ورموز کو بیان کریں جیسا کہ ہم نے سابقہ سطور میں وعدہ کیا تھا۔

بسم اللہ کی باء اور اس کا نقطہ

ہمارے مطابق بسم اللہ کی باء نے وجودِ عالم کو ظاہر کیا اور باء کے نقطے کے ساتھ عابد اور معبود میں فرق ہوا۔

(قیل للشبلی رضی اللہ عنہ انت الشبلی)

حضرت شیخ ابو بکر شبلی علیہ الرحمۃ سے لوگوں نے استفسار کیا: آپ شبلی ہیں؟

آپ نے فرمایا:

انا النقطۃ التی تحت الباء

میں وہ نقطہ ہوں جو باء کے نیچے ہے۔ (یعنی میں مخلوق ہوں اور عابد ہوں، منکسر ہوں اور عاجز ہوں) ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ شیخ نے یہ بات تمیز (فرق) کے لیے بیان کی۔ باء کا نقطہ عبد کا وجود ہے جس کے ساتھ حقیقت عبودیت کا تقاضا ہوتا ہے۔

شیخ ابو مدین علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔

(ما رایت شیئا الا ریت الباء علیہ مکتوبۃ فالباء المصاحبۃ للموجودات من حضرۃ الحق فی مقام الجمع والوجود)۔

"میں نے کوئی چیز ایسی نہیں دیکھی کہ جس پر باء نہ لکھا ہو پس مقام جمع اور وجود میں اللہ تعالیٰ سے باء کے موجودات کے لیے مصاحبت ہے"۔

یعنی عالم شہادت میں ہر چیز قائم وظاہر ہے اور یہ باء اسم ہمزۂ وصل کا بدل ہے جو کہ باء کے داخل ہونے سے پہلے اسم میں موجود تھا(اصل میں لفظ تھا: بِاسم)اور اس کی احتیاج بھی ہے کیونکہ ساکن حروف کے ساتھ گفتگو نہیں ہو سکتی۔پس ہمزہ کہ جسے قدرتِ محرکہ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے ،یہ ہمزہ وجود سے ایک عبارت کی خواہش کرتا ہے تاکہ اس کلام کو پہنچے جو ابداع سے ایجاد کیا گیا ہے
۔

(باسم کے)اس ہمزہ کو ساکن پیدا کیا گیا ہے جو کہ عدم ہے اور یہ محدث کا وجود ہے جو پہلے نہ تھا اور پھر پیدا کیا گیا اور وہ محدث نہیں ہے جو ملک میں میم کے ساتھ داخل ہوا۔چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔

أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ(سورۃالاعراف:۱۷۲)۔

ترجمہ: کیا میں تمہارا رب نہیں۔

قَالُوا بَلَى(سورۃالاعراف:۱۷۲)۔

ترجمہ: سب بولے کیوں نہیں۔

پس یہاں"بَلَى"کی باء ہمزہ وصل کا بدل ہو گئی،یعنی ازلی قدرت اور باء کی حرکت اس ہمزہ کی حرکت ہو گئی جو باعث ایجاد ہے اور باء اور ملے ہوئے الف(باسم)کے درمیان تفریق ہو گئی کیونکہ الف ذات کو اور باء صفت کو عطا کرتی ہے۔اسی وجہ سے باء کے نیچے نقطہ عین ایجاد کے لیے الف سے زیادہ حقدار ہے اور یہی موجودات ہے۔

باء میں یہ تین انواع مجتمع ہوئی ہیں:

۱۔باء کی صورت۔(ب)۔

۲۔باء کے نیچے کا لفظ۔

۳۔تینوں عالموں کی حرکات۔

جیسا کہ عالم کے درمیان توہم ہے ایسے ہی باء کے نقطے میں وہم ہے۔ باء ملکوتیہ ہے، نقطہ جبروتیہ ہے اور حرکت شادتیہ ملکیہ ہے۔ جب کہ الف ایسا محذوف ہے جو کہ باء کا بدل ہے، یہی حقیقت اللہ تعالیٰ سے قائم ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمتوں میں سے ایک رحمت اس نقطہ کے پردے میں رکھی ہے جو کہ باسم اللہ کی باء کے نیچے ہے۔ یہاں ہم اسی پر اکتفاء کرتے ہیں، پس اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھ لو۔

بسم اللہ کا الف

پھر ہم نے بسم اللہ کے الف کو سورۃ العلق کی آیت ۱:

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِي خَلَقَ (سورۃالعلق: ۱)۔

ترجمہ: پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔

اور سورۃ ہود کی آیت ۴۱:

بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرَاهَا وَمُرْسَاهَا (سورۃھود: ۴۱)۔

ترجمہ: اللہ کے نام پر اس کا چلنا اور اس کا ٹھہرنا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں باء اور سین کے درمیان الف ظاہر نہیں۔ جبکہ سورۃ ہود کی آیت نمبر ۴۱ میں باسم اللہ کی باء اور سین کے ت درمیان الف ظاہر ہے۔ یہاں باسم ہے اور بسم اللہ میں بسم ہے۔ اگر یہاں لفظ بإسم اللہ مجرھا میں الف ظاہر نہ ہوتا تو کشتی کبھی بھی رواں نہ ہوتی اور اسی طرح یہ الف اگر اقرأ بإسم ربک کے بإسم میں ظاہر نہ ہوتا تو حقیقت ظاہر ہی نہ ہوتی اور نہ ہی حقیقت اپنی صورت کا مشاہدہ کرتی۔ پس اے پڑھنے والے! تو غفلت والی نیند سے بیدار ہو کر اس پر خوب غور وخوض کر۔

سورتوں کے شروع میں الف بکثرت استعمال ہوا ہے، اس لئے اکثر جگہ وجود اور مثال کے قائم ہونے کی وجہ سے الف حذف ہو گیا۔ یہاں (باسم، بسم میں) اس کی مثل باء ہے جو کہ سین کے لئے آئینہ بن گئی اور سین ایک مثال بن گئی۔ چنانچہ یہی عربی کی ترکیب کا نظام ہے اور اس کی ترتیب اسی طرح ہے (کہ باسم کو بسم پڑھتے ہیں)

یاد رکھو! (بسم کی) سین اور میم کے درمیان (الف کا) ظہور نہیں ہوا، کیونکہ وہ افعالی صفات کی اور تبدیلی کی جگہ ہے۔ اگر (بسم میں) باء اور سین کے درمیان الف ظاہر ہوتا تو سین اور میم زائل ہو جاتے، کیونکہ باء کی طرح اس کی صفت قدیم ہو یہ لازم نہیں ۔ الف کا اخفاء ان الفاظ (بسم) کے لئے رحمت ہے، کیونکہ اسی اخفاء کی وجہ سے ان کے وجود کو بقا ملی ہے۔

رب تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيمٌ (الشوریٰ ۵۱)

کسی انسان کی یہ مقام نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام کرے، ماسوائے وحی کے یا پردے کے پیچھے سے یا پھر اس کی طرف پیغام رساں بھیجے اور جو چاہے اپنے حکم سے وحی کرے۔

یہاں پیغام رساں سے مراد یہی باء، سین اور میم (بسم) ہیں جو کہ تمام جہاں کی مثل ہیں۔

بسم اللہ کا الف اور میم

بسم اللہ کی میم میں حدوث کی مشابہت کے طریق کے مطابق زیر کا عمل ہے کیونکہ میم کا مقام مقامِ عبودیت ہے اور (بسم میں) باء کی زیر نے میم کو ذات کی معرفت اور حقیقت سے نوازا ہے۔

جب آپ باء کو ملاحظہ کریں تو میم کو مقامِ اسلام پر پائیں گے۔ اگر کبھی باء کسی حالت کے طاری ہونے کے سبب زائل ہو جائے تو یہ میم کا ایمان کی طرف ارتقاء ہو گا، اسی (بسم کی باء) کی بناء پر عالمِ جبروت میں تسبیح ہوتی ہے اور اسی (بسم کی باء) کی مثل کے سبب فتح اور کشادگی نصیب ہوتی ہے۔

یادرکھو! یہ معاملہ محل تنزیہہ کے ساتھ تجلی کے لئے مثل ہے، اسی لئے فرمایا:

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْأَعْلَى (الاعلیٰ ۱)

اپنے بلند وبالا رب کی تسبیح بیان کرو۔

یعنی اپنے اعلیٰ رب کے نام سے تسبیح پڑھ جس نے تجھے موادِ الٰہیہ سے غذا عطا فرمائی۔ یہاں (اسم کے) میم پر زبر ہے، اسی لئے "ربک" (تیرا رب) کا لفظ آیا ہے، پس اسم کے الف کو یہاں ظاہر کیا (جبکہ تسمیہ میں باسم اللہ کو بسم اللہ بیان کیا اور اسم کے الف کو واضح نہیں کیا۔) پس یہاں (سورۃ الاعلیٰ) اسم کا الف ظاہر ہوا اور باء زائل ہو گئی، گویا باسم سے اسم رہ گیا، یہاں اسم پر امرِ تسبیح متوجہ ہوا، جبکہ الف میں اس کی طاقت نہیں اور باء بھی اس کی مثل محدث ہے اور محدث حقائق کے باب سے وہ شے ہے جس کا امتثال امر سے نہ تو کوئی فعل ہوا اور نہ ہی کوئی بدل۔ پس لازماً الف سے ہی وہ ظاہر ہو گا جو کہ فاعل حقیقی ہے (اسی لئے اسم ربک فرمایا اور بسم اللہ کی طرح یہاں الف کو حذف نہیں کیا بلکہ اسے ظاہر کیا) جب (سورۃ الاعلیٰ کی آیت نمبر ا میں اسم کا) الف لفظ میں ظاہر ہوا تو قدرت نے میم میں تسبیح کی صورت پیدا کر دی، پس اس نے حکم کے مطابق تسبیح کی، پس یہاں الف کو ہی اعلیٰ کہا گیا ہے (اور اسم کی میم پر زبر آئی) جبکہ (بسم میں) باء شروع میں آنے کی وجہ سے یہ اسفل ہے (اور میم پر زیر ہے) سورۃ الاعلیٰ میں اسم اعلیٰ اور اسفل کے درمیان میں ہے (سبح اسم ربک میں سبح کی حاء پر زیر ہے اور ربک کے کاف پر زبر ہے یوں اسم زیر اور زبر کے درمیان

آیا)یوں تسبیح کرنے والاجو اس کی مثل یا اس کی مثل یا اس کے نیچے ہو، اس کی تسبیح نہیں کر سکتا۔ پس ایسی صورت میں تسبیح کرنے والا لازماً اعلیٰ ہو گا۔

اگر ہم (سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْأَعْلَی (الاعلیٰ ۱))"اپنے بلند و بالا رب کی تسبیح بیان کرو۔" کی تفسیر اور اسرار کو ظاہر کریں تو یہ ختم نہ ہونے والا بیان ہو گا۔ پس ثابت ہوا کہ الف یہاں ہمیشہ پاکی اور تنزیہہ بیان کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنی ذات میں منزہ ہو جاتا ہے، پس جو کوئی بھی منزہ کی تنزیہہ بیان کرتا ہے وہ تنزیہہ کے سبب منزہ ٹھہرتا ہے، پس یہ بدیہی امر ہے کہ تنزیہہ ہر صورت میں منزہ کی طرف پلٹتی ہے اور وہی اعلیٰ ہے۔

جان لو کہ حق حقیقت کے باب سے ہے اور کسی کا اس سے اعلیٰ ہونا درست نہیں ، کیونکہ یہ اسمائے اضافت میں سے ہے، اور وجوہِ مناسبہ کی قسم میں سے ہیں۔ پس یہ اعلیٰ ہیں نہ ہی اسفل اور نہ ہی اوسط جبکہ اللہ تعالیٰ اس سے بہت بلند ہے، اس کے لئے اعلیٰ، اوسط اور اسفل برابر ہیں، جب وہ ان چیزوں (اعلیٰ، اسفل اور اوسط کے ظاہری معنی) سے منزہ ہے تو حدِ امر سے خارج ہے۔

البتہ سماعت کا پردہ چاک ہوا اور اعلیٰ مقام حاصل ہوا۔ پس (سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ کی) میم مشاہدۂ قدیم کے ساتھ بلند ہو گئی (اور یوں میم پر زبر آئی)۔ پس تیرے جلال و عزت والے رب کے برکتوں والے اسم کے ساتھ ثناء تکمیل تک پہنچی۔

جس طرح اسم مسمیٰ کا عین ہوتا ہے اسی طرح عبد معبود کا عین ہوتا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ جو اللہ تعالیٰ کے تواضع اختیار کرتا ہے، تو اللہ اسے بلند کر دیتا ہے۔

صحیح حدیث میں ہے:

ان الحق یدالعبد ور جلہ ولسانہ و سمعہ و بصرہ۔

”اللہ تعالیٰ بندے کا ہاتھ، اس کا پاؤں، اس کی زبان، اس کی سماعت اور اس کی بصارت ہو جاتا ہے۔“

اگر الف اسم میں باء سے پستی یعنی زیر کو قبول نہ کرتا تو اسے تبارک اسمَ کے اسم میں انتہا پر بلندی یعنی زبر حاصل نہ ہوتی۔

بسم اللہ کی سین

یاد رکھو! طبقاتِ عالم پر بسم کا ہر حرف مثلث (تیسرا) ہے۔ پس ب (باء) کا اسم باء الف اور ہمزہ کا مثلث ہے۔ س (سین) سین، یاء اور نون کا مثلث ہے اور م (میم)، یاء اور میم کا مثلث ہے۔ یاء باء کی مثل ہے اور بابِ ندامہ میں ہے، یہی عہد کی حقیقت ہے۔ اگر سوال کیا جائے:

(فما اشرف هذا الموجود کیف انحصر فی عابد و معبود فهذا اشرف مطلق لا یقابله ضد لان ماسوی وجود الحق تعالیٰ و وجود العبد عدم محض لا عین له)۔

”اس موجود میں اشرف ہے یا اس کا انحصار عابد و معبود پر کیسے ہے تو یہ مطلق شرف ہے، اس کے مقابلہ میں ضد نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے وجود اور عبد کے وجود کے سوا عدمِ محض ہے، جس کا عین نہیں۔“

پس بسم میں سین ساکن ہے تو یہ فقر و فاقہ کی علامت ہے، جیسا کہ ہم نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم کی اطاعت کے تحت ساکن ہیں۔ رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللهَ (سورۃ النساء: ۸۰)۔

ترجمہ: ”جس نے رسول کا حکم مانا بے شک اُس نے اللہ کا حکم مانا“۔

سَأَصْرِفُ عَنْ آيَاتِيَ الَّذِينَ يَتَكَبَّرُونَ (سورۃ الاعراف: ۱۴۶)۔

ترجمہ: ”اور میں اپنی آیتوں سے انہیں پھیر دوں گا جو زمین میں ناحق اپنی بڑائی چاہتے ہیں“

پس اطاعت گزار کے لیے سین اس کی رحمت اور نرمی سے ساکن ہو گیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

یہاں مراد باء کا حضور ہے، جنت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم کا حضور ہے اور دیدار کا ٹیلہ (کثیب، جہاں اہل جنت اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے، وہ) حق تعالیٰ کا حضور ہے۔ پس اگر تم اس کی تصدیق کروگے اور اسے تسلیم کروگے تو تجھ پر اسرار کھل جائیں گے اور تیرا الحاق ہو جائے گا۔ یہ وہی حضور ہے جو مراد کے الف کی طرف انتقال کرتا ہے جیسا کہ حضور آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف منتقل کرتا ہے، اسی طرح یہ حضور جو کہ جنت ہے آپ کو اس ٹیلے (جنتی، ٹیلہ کثیب، اللہ تعالیٰ کے دیدار کے لیے اہل جنت کثیب ٹیلے کی طرف سفر کریں گے) کی طرف منتقل کرے گا جو اللہ تعالیٰ کا حضور ہے۔

پس یاد رکھو کہ سلامٌ میں تنوین عبودیت کی تحقیق اور تبعیض کے اشارات کے لیے ہے، جب اس سے تنوین کا ظہور ہوتا ہے تو حق المبین یعنی اللہ تعالیٰ اسے تشریف وتمکین کی اضافت کے ساتھ منتخب کرلیتا ہے۔

اسی لیے فرمایا:

بسم اللہ

ترجمہ: ”اللہ کے نام سے“۔

پس منزل الٰہیہ کی طرف اس کی اضافت کے لیے تنوینِ عبدی (سلام کی میم سے) حذف ہو گئی ، پس تنوین پیدا ہو گئی، اس لیے یہ تحقق اس کے لیے درست ہے، البتہ ساکن ہونا زیادہ بہتر ہے۔ پس اسے یاد رکھنا۔

لفظِ ”اللہ“ کی تشریح

وصل:

اے ہدایت کے راستے کے راہی! بسم اللہ میں ارشاد ہے: "اللہ"۔ پہلے آپ اس بزرگ کلمہ سے حاصل ہونے والے حروف کی پہچان حاصل کریں، بعد میں اگر اللہ نے چاہا تو اس پر تفصیلاً گفتگو ہوگی۔ اس کلمہ کے حروف یہ ہیں: ا۔ل۔ل۔ہ۔

پہلے ہم اس پر اشاروں کنایوں میں مجمل کلام کریں گے، پھر اسے تفصیلاً واضح کریں گے تاکہ عالمِ ترکیب پر اسے قبول کرنا سہل ہو جائے۔

الف کے ساتھ عبد کا تعلق اضطاری اور التجاءٗ ہے۔ پس اس کے لیے پہلا لام ظاہر ہوا جیسے یہ فوز و نجات عدم سے ورثہ میں عطا ہوئی ہے، پس جب اس کا ظہور درست ہوا اور اس کا نور وجود میں منتشر ہو گیا اور یوں مسمیٰ کے ساتھ اس کا تعلق درست ہو گیا، اور اسماء کے ساتھ اس کا پیدا ہونا باطل ہو گیا۔

پھر لام کے بعد آنے والے الف کے شہود کے ساتھ دوسرے لام نے اسے ایسی فنا سے فانی کر دیا جس کے بعد اس کا کچھ باقی نہیں رہا اور یہ اس لیے ہے کہ اس کا معمہ کھل جائے، پھر مراد کے تمکن کے لیے با کے بعد واؤ آئی اور ہا اس کے بعد آئی اور ہا اس کے بعد آئی تاکہ بندوں کی محویت کے وقت اجلِ عناد سے اپنے وجود کے لیے باقی رہے پس اس لیے یہ اجل مسمی کا موقعہ ہے اور یہ وہ مقام ہے جس میں سیاحوں کے احوال مضمحل ہو جاتے ہیں اور جس میں سالکین کے مقامات معدوم ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ جو نہیں تھا وہ فنا ہو جاتا ہے اور جو ہمیشہ ہے وہ باقی رہتا ہے، نہ اس کے ظہور کے لیے غیر ثابت ہے اور نہ اس کے نور کے لیے اندھیرا باقی رہتا ہے۔

اگر آپ اسے ملاحظہ نہیں کر رہے ہے تو جان لو کہ اگر نہ تھے تو وہ آپ ہی تھے کیونکہ ذوات کے لیے افعالِ مضارع میں تاء حروف زوائد سے ہے اور یہی عبودیت ہے۔

ایک چھینکنے والے نے الحمد اللہ کہا تو ایک سردار نے سن کر کہا:

(اتمها كما قال الله رب العالمين)

ترجمہ: ”جملہ پورا کرو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: الحمدللہ رب العالمین“۔

چھینکنے والے نے کہا:

(ياسيدنا و من العالم حتى يذكر مع الله)۔

ترجمہ: ”اے ہمارے سردار! عالم کون ہے؟ یعنی عالم کیا ہے کہ جس کا میں ذکر اللہ کے ساتھ کروں؟

(الان قله يا اخی فان المحدث اذا قرن بالقديم لم يبق له اثر)۔

ترجمہ: ”اے میرے بھائی! یہ اس وقت کہہ دے، کیونکہ جب محدث کا ذکر قدیم کے ساتھ کیا جائے تو اس کا اثر باقی نہیں رہتا“۔

یہ مقام وصل اور حال ہے اور کہنے والا اہل فنا سے ہے، جو اپنے نفسوں سے فانی ہیں۔ اگر اپنی فنا سے فانی ہو جاتے تو الحمد اللہ کیوں کہتے۔

الحمد للہ کہنے سے بندے کے عبد ہونے کا اثبات ہوتا ہے۔ صوفیاء میں سے بعض کے نزدیک عبد رداء سے اور بعض کے نزدیک لباس سے تعبیر ہوتا ہے۔

اگر وہ الحمد اللہ کے ساتھ رب العالمین کہتا ہے تو اس مقام سے بہت بلند ہو جاتا ہے جس میں وہ تھا، اس لیے کہ یہ وارثین کا مقام ہے اور اس سے اعلیٰ اور کوئی مقام نہیں، کیونکہ یہ وہ شہود ہے جس کے ساتھ نہ زبان متحرک ہوتی ہے اور نہ ہی اس مقام والوں کے احوال میں اور ان کے دلوں میں اس

کے ساتھ کوئی اضطراب پیدا ہوتا ہے (یوں وارثین کا مقام ہر اعتبار سے امن والا ہے، روحانی اعتبار سے بھی اور ایمانی اعتبار سے بھی)۔

وارثین کے رخوں پر انوار ذات غلبہ پالیتے ہیں اور ان پر رسول صفات خوب ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ عرائس ہیں۔ عبدیت اس کے نزدیک ایسے حجابوں میں سے ایک حجاب ہے، کہ جن حجابوں کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، یہ معاملہ اسی طرح ہے جس طرح وارثین اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں جانتے۔

ان وارثین کو قیومی زبان کے ساتھ، انس کی بساط اور دائمی مناجات میں رب تعالیٰ اپنے قرب سے عزت وکرامت کا تاج وخلعت پہنا کر فنا کے منبروں پر بٹھا دیتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے وارث ہوتے ہیں:

عَلَی صَلَاتِھِمْ دَائِمُونَ (سورۃ المعارج:۲۳)۔

ترجمہ: جو اپنی نماز کے پابند ہیں۔

هُمْ بِشَهَادَاتِهِمْ قَائِمُونَ (سورۃ المعارج:۳۳)۔

ترجمہ: اور وہ جو اپنی گواہیوں پر قائم ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی قوت مشاہدہ کے ساتھ ہمیشہ نیک لوگوں کی مدد ونصرت کرتی ہے۔

وہ مقامِ قرب میں صفات کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔

یہ معاملہ اقتداء اور پیروی کی حیثیت رکھتا ہے (ہمیں بھی نیکی میں ان کی اتباع کر کے قرب الٰہی پانے کی کوشش کرنی چاہیے)۔

یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو فرائض وسنن پر قائم رہتے ہیں اور قرآن وسنت کے علاوہ کوئی بات نہیں کرتے۔

وہ کبھی بھی سیدھے راستے سے رُخ نہیں پھیرتے۔

وہ مخلوق سے گفتگو کرتے ہیں مگر ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہتے ہیں۔

وہ مخلوق سے میل جول رکھتے ہیں لیکن جلوت میں بھی خلوت کا سماں ہوتا ہے اور وہ اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

وہ لوگوں کو دیکھ کر بھی نہیں دیکھتے، کیونکہ وہ خود کو بھی نہیں دیکھتے۔

وہ تو اپنا اور مخلوق کا ہونا بھی اللہ تعالیٰ کے افعال کے جمال و مظاہرے سے دیکھتے ہیں۔

وہ سیدنا عمر فاروق کے مقام میں (ان کی طرح) صنعت میں صانع کا مشاہدہ کرے ہیں (صنعت انہیں ہر چیز میں اللہ کی یاد دلاتی ہے)۔

جس طرح کوئی آدمی بڑھئی کے پاس بیٹھ کر صندوق بنتا ہوا دیکھے تو وہ صنعت اور صانع کا مشاہدہ کرتا ہے۔ صنعت کبھی بھی صانع سے حجاب نہیں بنتی (مخلوق کو دیکھ کر خالق کو یاد کرتے ہیں۔)

(دنیا مخلوق ہے اور اللہ تعالیٰ خالق، دنیادار مخلوق میں کھوئے رہے جبکہ اللہ والوں نے ہمیشہ مخلوق کو دیکھ کر اللہ کو یاد کیا اور اس کی طرف متوجہ ہوئے۔) جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم نے فرمایا:

(حلوة خضرة)[21]

”دنیا سرسبز ہے، اور یہ وادی کی ہریالی ہے“۔

کسی شاعر نے دنیا کا خوب نقشہ کھینچا ہے:

اذا امتحن الدنیا لبیب تکشفت

---

[21] إتحاف الخيرة المهرة بزوائد المسانيد العشرة ج۷ ص ۴۴۲

لہ عن عدو فی ثیاب صدیق

"عقل مند آدمی جب دنیا کو آزماتا ہے تو یہ اس کے لیے دوست کے لباس میں پوشیدہ دشمن کو ظاہر کر دیتی ہے۔"

دنیا کی حقیقت کو سمجھنے والی جماعت صدیقین کی جماعت ہے اور یہ طائفہ امین ہیں۔۔ جب اللہ تعالیٰ اپنی قوت سے ان کی مدد فرماتا ہے تو یہ اللہ کے ساتھ منسوب ہو جاتے ہیں، مثال کی وجہ سے (جو کہ حدیث میں آئی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرض کے بعد نفل پڑھنے والے کو اپنا خاص قرب بخشتا ہے، حتی کہ اس کے سننے کی قوت، دیکھنے کی قوت اور چلنے و پکڑنے کی قوت بن جاتا ہے۔) یہ وہ اعلیٰ مقام ہے کہ جس میں ارتقاء ہوتا رہتا ہے (بندہ قرب الٰہی میں اپنے عمل ویقین کے ذریعے ترقی کرتا رہتا ہے) اور یہ وہ مقام ہے کہ جس کی غایت کی طرف انتہائے غایت ہے۔ کیونکہ اس مقام کی کوئی غایت نہیں مگر موارد وارادات کی حیثیت سے نہیں بلکہ توحید کی حیثیت سے۔

ذات باری تعالیٰ مستوی ہے اور سوائے اس کے کوئی استواء نہیں کرتا، پس اس جماعت کو جو مشاہدات کے حقائق معلوم ہوئے ہیں وہ انہیں اور ہم کو مبارک ہوں، ہم ان مشاہدات کی تصدیق کرتے ہیں اور انہیں تسلیم بھی کرتے ہیں۔

ہم نے ان کے ساتھ ہمیشہ موافقت ومساعدت کی ہے اور یہ سب باتیں زبان کا جواد (زبان دانی اور روزِ کلام) ہمارے لیے بطور حلیۃ الکلام (کلام کے دائرے کے طور پر) لے آیا، اب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف پلٹے ہیں، یہ وہی راستہ ہے کہ جس کی طرف ہم جا رہے ہیں۔ آپ پر اللہ کی سلامتی ہو۔

لفظ اللہ کی تشریح۔۔۔۔۔ الف، لام اور ھو

ہم کہتے ہیں کہ لفظ اللہ میں محذوف ہمزہ اضافت کے لیے ہے اور اتصال کی تحقیق وحدانیت پر دال ہے۔ تمحیق انفصال غیرت ہے۔ پس الف اور لام ملا ہوا ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا کہ متصل تحقیق اور منفصل محق کے لیے ہوتا ہے، (محق کی تحقیق شیخ کی کتاب الاءسفار یعنی قرآنی اسفار اور ان کے نتائج مطبوعہ مشتاق بک کارنر الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور میں گزر چکی ہے) لفظ اللہ میں الف غیر متحصل محو آثار کے لیے ہے، یہ چیز دوسری لام میں موجود ہے، اور واؤ جو ہا کے بعد آتی ہے۔ (اللہ۔ ال لٰ ہ و) اس کے لیے خط میں کوئی نشان، علامت یا صورت نہیں (وہ پیش کی وجہ سے اللہُ میں پڑھنے میں آتی ہے لیکن لکھنے میں نہیں آتی،) اس کا معنیٰ ہویت کی ہا کے ساتھ وجود میں ہے، اس ہا کو اس نے اس کی ذات کے ساتھ عالمِ ملک میں منتشر کیا۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔

هُوَ اللهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ (سورۃ الحشر: ۲۳)۔

ترجمہ: وہی ہے اللہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت کی ابتداء ہویت یعنی هُو سے کی اور انتہا بھی هو پر کی، پس یوں اسے وجود اور عدم کے معاملے میں ملکیت عطا کی۔ اس کے ذریعے حدوث وقدم پر دلالت مقرر کی، اسی لیے هو ہی ذاکرین کا آخری اور اعلیٰ ذکر ہے۔

یاد رکھو! جب عجز سینے کی طرف پلٹا تو لیلۃ القدر ظاہر ہوئی، اہل صفا وتائید کو اس کی بدولت حقائق سے واقفیت ممکن ہوئی، پس وجود "ھو" کے دائرہ کے نقطہ میں ساکن ہے۔ اور وہ اس پر اس کی حقیقت کے ساتھ مشتمل ہے۔ ممکنات کا مشتمل ہونا متمکن ساکن پر ہے، یعنی مقامات ساکنین پر مشتمل ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے لیے ہی مثلِ اعلیٰ ہے۔

شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

واللہ قد ضرب الاقل لنورہ

مثلامن المشکوۃ والنبراس

"اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کی مثال بیان فرمائی، جیسے تشت اور نبراس۔"

یہاں سورۃ النور کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے:

اللَّهُ نُورُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ مَثَلُ نُورِهِ كَمِشْكَاةٍ فِيهَا مِصْبَاحٌ الْمِصْبَاحُ فِي زُجَاجَةٍ الزُّجَاجَةُ كَأَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُوقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُبَارَكَةٍ زَيْتُونَةٍ لَا شَرْقِيَّةٍ وَلَا غَرْبِيَّةٍ يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُورٌ عَلَى نُورٍ يَهْدِي اللَّهُ لِنُورِهِ مَنْ يَشَاءُ وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (سورۃ النور:۳۵)۔

ترجمہ: اللہ نور ہے آسمانوں اور زمین کا اس کے نور کی مثال ایسی جیسے ایک طاق کہ اس میں چراغ ہے وہ چراغ ایک فانوس میں ہے وہ فانوس گویا ایک ستارہ ہے موتی سا چمکتا روشن ہوتا ہے برکت والے پیڑ زیتون سے جو نہ پورب (مشرق) کا نہ پچھّم (مغرب) کا قریب ہے کہ اس کا تیل بھڑک اُٹھے اگرچہ اُسے آگ نہ چھوئے نور پر نور ہے اللہ اپنے نور کی راہ بتاتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ مثالیں بیان فرماتا ہے لوگوں کے لیے اور اللہ سب کچھ جانتا ہے۔ مترجم۔

چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُحِيطًا (سورۃ النساء:۱۲۶)۔

ترجمہ: اور ہر چیز پر اللہ کا قابو ہے۔

پھر فرمایا:

قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا (سورۃ الطلاق:۱۲)۔

ترجمہ: اور اللہ کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔

اللہ تعالیٰ کے علم نے ہر ایک چیز کو اسم اور مسمیٰ قرار دیا ہے اور اس کو مکشوف اور معمہ بنایا ہے۔ اس تالے کی چابی اور اس مختصر کی تشریح یہ ہے کہ بندہ کہتا ہے: اللہ تعالیٰ تو اول و آخر کا اثبات فرماتا

ہے اور (لفظ "اللہ" ا۔ل۔لٰ۔ہ) دونوں لاموں کے ساتھ باطناً وظاہراً نفی کرتا ہے۔ اور الف علمیہ کی وساطت سے دوسرا الام ھا کے ساتھ ملا ہوا ہے۔

چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

مَایَکُونُ مِنۡ نَجۡوَی ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُوَ رَابِعُهُمۡ (سورة المجادلة:۷)۔

ترجمہ: جہاں کہیں تین شخصوں کی سرگوشی ہو تو چوتھا وہ موجود ہے۔

غور کرو، یہاں تین لام ہیں۔ (ثلاثۃ کا لام۔ الا کے دو لام)

پھر فرمایا:

وَلَا خَمۡسَةٍ إِلَّا هُوَ سَادِسُهُمۡ (سورة المجادلة:۷)۔

ترجمہ: جہاں کہیں پانچ شخصوں کی سرگوشی ہو تو چھٹا وہ موجود ہے۔

یہاں غور کرو کہ الف ہاء کے حق میں چھٹا ہے اور لام کے حق میں چوتھا۔

ارشاد ربانی ہے:

أَلَمۡ تَرَ إِلَی رَبِّکَ کَیۡفَ مَدَّ الظِّلَّ (سورة الفرقان:۴۵)۔

ترجمہ: اے محبوب کیا تم نے اپنے رب کو نہ دیکھا کہ کیسا پھیلا یا سایہ۔

عرش اللہ تعالیٰ کا ظل مبارک ہے اور لام دوسرا عرش ہے اور جو اس کے گرد ہے وہ ملک کے طریق پر پہلا لام ہے، دونوں لام باب اسماء سے ظاہر وباطن ہیں، جو پہلے ایک دوسرے الف کے درمیان ظاہر ہوئے اور یہ مقام اتصال ہے۔ کیونکہ انتہاء ابتداء کی طرف منعطف ہوتی ہے اور اس نزدیکی کے ساتھ اتحاد واتصال ہوتا ہے، پھر ھا اپنی باطنی واؤ کے ساتھ انفصال کے مخرج سے نکلی ہے ،ہا اور لام کے متصل جزایک ایسا سر ہیں کہ جس کے ساتھ عبد ااور سید کے درمیان مشاہدہ واقع ہوتا ہے اور یہ الف علمیہ کا مرکز ہے اور مقام اضمحلال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلی لام جو کہ عالم ملک کی ہے

اور دوسری لام جو عالم ملکوت کی ہے، اس کے درمیان دونوں لاموں کے اتصال کے لیے خط متصل میں جزء مقرر فرمایا اور یہ عالم اوسط کا مرکز ہے جو کہ مقام نفس عالم جبروت ہے۔ پس دونوں حروف کے درمیان خطوط فارغہ کا ہونا ضروری ہے، ایک حرف سے دوسرے حرف کی طرف ہی تو سالکوں کی رسموں کے مقاماتِ فنا ہیں۔

پہلا الف وہ ہے جو ہمزہ کو منقطع کرتا ہے اور دوسری لام کا الف اس کے ساتھ ملا ہوا ہے، الف خطوط کے شروع میں منقطع کیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم کا ارشاد عالی شان ہے:

("كان الله ولا شيء معه")[22]

ترجمہ: اللہ تعالیٰ تھا اور اس کے ساتھ کوئی چیز نہیں تھی۔

اسی لیے یہ الف قطع کیا گیا، یہ عدم اتصال میں بعد میں آنے والے حروف کی مشابہت سے پاک ہے اور یہ وہ حرودف ہیں جو حقائق عامہ عالیہ کے عدد پر اس کے مشابہ ہیں اور یہی امہات حقائق ہیں۔ بالکل اسی طرح جب حروف کا آخر ہو گا تو بعد میں لکھے جانے والوں سے اس کا تعلق قطع ہو جائے گا۔ پس الف اور اس قبیل کے حروف کا منقطع ہونا وہ انتباہ ہے کہ جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ یہاں الف حق تعالیٰ کے لیے اور الف سے مشابہت رکھنے والے حروف خلقت و مخلوق کے لیے ہیں اور وہ حروف یہ ہیں: د۔ ذ۔ ر۔ ز۔ یاد رکھو جمیع حقائق میں غذا دینے والا ایک ہی ہے۔

کچھ حروف وہ ہیں کہ جن کے لیے لغت ہے اور کائنات کی حقیقتیں کلیہ میں منحصر ہیں، جب دوسرے لام نے ارادہ کیا، یہ لام معنیٰ میں پہلے اور خط میں آخر پر موجود ہے تو اس کے لیے مشاہدہ سے

---

[22] مسند الإمام أحمد بن حنبل ج٣٣ ص ١٠٩

جسم کی معرفت ،روح کی معرفت پر مقدم ہوئی ،ایسے ہی خط کامشاہدہ ہے اور یہ عالم ملکوت ہے جسے اس نے اپنی قدرت سے پیدا فرمایا۔

اس ہمزہ کی ابتداء اسم میں اضافت سے معرا ہوئی اور یہ کبھی بھی الف سے علیحدہ نہیں ہوتا۔ جب اس الف نے دوسرے لام کو لیا تو اسے سردار بنایا اور اس سرے کو طلب کیا جو کہ اس پر بالطبع پہلے ہی موجود تھا، پھر اس الف نے اس لام کے لیے عالم شہادت بنایا جو پہلا لام تھا۔ جب اس نے دیکھا تو روشن ودرخشاں ہو گیا اور اس کے رب کے نور سے زمین جگمگا اٹھی اور تب کتاب تخلیق کی گئی ۔یہ وہ جزء ہے دو لاموں کے درمیان ہے۔

رب تعالیٰ کے حکم سے پہلی لام نے دوسری لام کی مدد کی ،جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے جودوکرم سے اس کی مدد فرمائی اور یہ اس کی طرف اس کی دلیل بنی۔ اس نے جمیع انوار میں اسی سے تصرف کے معانی طلب کیے، گویا یہ اس کی وزیر ہے ۔ چنانچہ اس نے جو چاہا اسے پالیا ،پھر اسے پہلے لام کے لَم پر القاء فرمایا،یوں دو لاموں کے متصل جزء کو پیدا کیا، اسے کتابِ اوسط سے تعبیر کیا گیا،یہی تو عالم جبروت ہے،اس کے لیے دونوں لاموں کی مثل ذات قائمہ نہیں۔ عالم جبروت ہمارے ہاں تو عالم خیال کی طرح ہے۔

دوسری لام کو اس جزء کی طرف ملایا گیا اور جو اس سے چاہا گیا تھا اس میں رقم کر دیا گیا،اس کے ساتھ پہلے لام کی طرف توجہ دی گئی اور فرماں برداری طلب کی ،یہاں تک کہ اس نے اثبات میں جواب دیا،جب پہلے لام نے اس امر کو ملاحظہ کیا تو اسے اس جزء کی وساطت سے دوسرے لام سے مشاہدہ اس میں راغب کرنے لگا تاکہ مشاہدہ میں مشغولیت ہو گئی تو اس سے پہلے الف پردہ میں چلا گیا۔ سابقہ دلائل کو علم کی روشنی سے دیکھو،اگر اس جزء کی طرف ہمت نہ لگتی تو الف سے بلا واسطہ امر

واقع ہو جاتا، یہ معاملہ عظیم بھید کے لیے ممکن نہیں تھا، پس بے شک پہلا الف ذات اور دوسرا الف علم کی علامت ہے۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ دوسری یلام واسطوں سے کس طرح پاک ہے اور یہی مراد اور چنی ہوئی ہے۔ الف وحدانیت کے ساتھ کس شان کے ساتھ متصل ہے، یہاں تک کہ اسکا وجود نطق بن کر الف پر صحیح معنی میں دلالت کرتا ہے، اگرچہ ذات مخفی ہے۔ اس الف کا تلفظ لالم کے ساتھ ملا ہوا ہے اور یہی بات محقق ہے۔ اس پر یہ قول دلالت کرتا ہے:

(من عرف نفسه فقد عرف ربه)[23]

"جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کی معرفت حاصل کرلی۔"

یعنی جس نے دوسری لام کو پہچان لیا تو اس نے الف کو پہچان لیا، اس پر انسانی نفس کو دلیل بنایا گیا، انسانی نفس کے دلیل ہونے کو اس پر، اس کے حق میں دلیل بنایا گیا جو کہ دور ہے، رب تعالیٰ کی معرفت پر عبد کے لیے اپنے نفس کی معرفت مقدم بنائی گئی۔ پھر جب اس نے اپنے نفس کو پہچان لیا تو اس کے نفس کی معرفت کو فنا کر دیا گیا کیونکہ معرفتِ نفس سے مراد ہی یہ تھی کہ وہ اپنے رب کو پہچان لے (پس معرفت ربانی کے حصو کے ساتھ ہی معرفتِ نفس کی ضرورت نہیں رہی، پس وہ فنا ہوگئی۔)

کیا آپ نے دیکھا ہے کہ لام الف سے کیسا معانقہ کرتی اور ملتی ہے؟ کیا آپ نے دیکھا کہ لام الف سے پہلے کس طرح میں پائی جاتی ہے؟ یقیناً اس معاملے میں ادراک کرنے والے کے لیے نتیجہ ہے۔ پس لام ملکوتی ہے جو بغیر واسطے کے وحدانیت کے الف سے ملی ہوئی ہے۔ پس اسے جبروتی جزپر

---

[23] رسالہ قشیریہ، شرح کشف المحجوب

شہادت وفلک کی لام کی طرف لوٹانے کے لیے وارد کیا گیا ہے، پس جان لو کہ ترکیب وحجاب کا معاملہ بالکل اسی طرح ہے۔

لفظ اللہ کی تشریح۔۔۔۔اللہ کی لام اور ھا

جب لام اول وآخر ظاہر وباطن ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ انتہاء کو ابتداء کی نظیر ٹھہرایا جائے۔یادرکھو حروف کے ساتھ الف میں ہر اعتبار سے اتصال مقدم اور منزہ ہے۔پس عبد کے لیے اول و آخر اور بقادرست نہیں۔پس ہائے مفردہ کو ہویت (ھُو) کی واؤ کے ساتھ پیدا کیا گیا۔اگر کسی وہم والے کو وہم ہو کہ ہاتولام کے ساتھ ملی ہے تو اس کا یہ وہم درست نہیں۔یقیناً یہ لام اس لاف کے بعد ہے جو کہ لام کے بعد آتا ہے(اور ہم سے کھڑے زبر سے پڑھتے ہیں)الف دوری میں اس چیز کے ساتھ متصل نہیں۔

پس یادرکھو کہ لام کے بعد ہاء ہر چیز سے الگ ہے۔لام کے ساتھ اس کا یہ اتصال خط میں نہیں ہے۔پس ہاء ایک ہے اور الف بھی ایک ہے۔ایک کو ایک کے ساتھ ضرب دی جائے تو وہ اپنی ضرب میں ایک ہی رہے گا۔ چنانچہ حق سے مخلوق منفصل ہے اور علیحدہ ہے، یہ بات واضح ہے، مخلوق فانی اور حق تعالیٰ باقی ہے۔

ملکیت کے لام کا تخلق درست ہے کیونکہ اس پر ملکوت کا لام وارد ہوتا ہے، یہ اپنی صفات سے ہمیشہ مضحل رہتا ہے، حتی کہ اپنے رسول سے فانی ہو جاتا ہے اور اسے اپنی ذات سے مقام فنا حاصل ہو جاتا ہے۔پس جب یہ اپنی ذات سے فنا ہو جاتا ہے تو اپنی فنا کے لیے جز میں فنا ہو جاتا ہے اور دونوں لاموں کے تلفظ کا کلام میں اتحاد ہو جاتا ہے۔پس یوں زبان ان دونوں کو پڑھنے کے لیے ایک دوسرے میں مدغم کرتی ہے اور تشدید سے کام لیتی ہے (پس یوں اللہ پڑھا جاتا ہے۔اور لام پر شد

پڑھی جاتی ہے) یہ شد دونوں الفوں (الف اور کھڑی زبر) کے درمیان موجود ہیں، یہ شد ان پر مشتمل ہے اور ان کا احاطہ کرتی ہے۔

جب ہم نے دونوں الفوں کے درمیان بغیر بولنے والا لفظ سنا تو ہمیں حکمت موہو بہ عطا ہوئی ۔پس ہم نے بدیہی علم سے جان لیا کہ قدیم کے ظہور سے محدث فانی ہو جاتا ہے۔ پس پہلا اور دوسرا الف باقی ہے اور کلمہ نفی کے ساتھ دونوں لاموں کے زائل ہونے سے ظاہر وباطن زائل ہو جاتا ہے۔ ہم نے ایک دوسرے سے ضرب دینے کی طرح الف کو الف سے ضرب دی تو اس سے آپ کے لیے "ھا" بر آمد ہوئی۔ جب یہ ظاہر ہوئی تو اول وآخر کا وہ حکم زائل ہو گیا جسے اس نے واسطہ مقرر کیا تھا، جس طرح کہ ظاہر وباطن کا حکم زائل ہو جاتا ہے، پس اس مقام پر کہا جاتا ہے:

("كان الله ولا شيء معه")[24]

ترجمہ: اللہ تعالیٰ تھا اور اس کے ساتھ کوئی چیز نہیں تھی۔

جان لو کہ اس ضمیر کی اصل ھا ہے جو کہ رفع ہے اور لازم ہے کہ وہ زبر ہو یا زیر، پس یہ صفت اس کی زبر یا اس کی زیر پر لوٹ آتی ہے اور لفظ میں یہ صفت عامل پر لوٹتی ہے۔(کبھی لفظ اللہ پڑھا جاتا ہے اور کبھی اس سے پہلے کسی لفظ کے آنے کی وجہ سے اللہ یا اللہ پڑھا جاتا ہے)۔

تکملہ

اللہ تعالیٰ نے حرکات وحروف اور مخارج کو تخلیق فرمایا، انہی سے رب تعالیٰ نے صفات ومقامت کے ساتھ ذوات میں فرق کی دلیل قائم فرمائی، اسی نے حروف کو موصوف کی نظیر بنایا اور مخارج کو مقامات و معارج کی علامت بنایا۔ حروف سے اس اسم کے لیے اس کے وصل و قطع کی وجوہ

[24] مسند الإمام أحمد بن حنبل ج۳۳ ص ۱۰۹

سے علی العموم حروف عطا کیے ،یعنی ہمزہ،الف،لام ،ہاء اور واؤ۔ پس پہلا حرف ہمزہ ہے اور آخری حرف واؤ ہے،دونوں کا مخرج ایک ترجمانِ قلب یعنی زبان ہے،پس دونوں لاموں اور ہمزہ اور ہاء کے درمیان نسبت واقع ہوگئی،جیساکہ دل اور زبان کے درمیان نسبت واقع ہوئی ہے جوکہ محل کلام ہے اور زبان کے درمیان اس کا مترجم ہے۔

اخطل شاعر نے کیاہی خوب کہاہے:

ان الکلام لفی الفواد وانما

جعل اللسان علی الفواد دلیلا

”یقیناًکلام دل میں ہے اور بے شک زبان تو دل کے کلام پر دلیل بنائی گئی ہے۔“

جب لام زبان سے ہے تو اسے اس کی ذات کے بجائے زبان کی طرف ناظر مقرراور اسے اس سے فنا کر دیا،اس کا مخرج تالو کانچلا حصہ ہے،جسے اس نے دیکھا اور خود کو نہ دیکھا تو اوپر کے تالو کی طرف مرتفع ہوگیا،اس (لام) کی ادائیگی میں تالو کی سختی کے سبب زبان بھی سخت ہوگئی۔اس کا ارتفاع اور بلندی ہی اس کا مشاہدہ ہے۔واوجودِ ظاہری کی طرف سے ہونٹوں سے نکلی،یہ خبر دینے والے کی دلیل ہے اور خبر دینا نبوت کا باطنی مقام ہے،اور یہ وہ چیز ہے جو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم کی طرف سے امت کے لیے ہے(کہ آپ نے اللہ کے احکامات کی امت کو خبر دی)اوراس میں وراثت ہوتی ہے نبوت کا سلسلہ رسول خاتم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم پر ختم ہوگیا،اب تبلیغ دین کرنا امت کی ذمہ داری ہے)۔

اس وصل سے یہ نتیجہ نکلاکہ ہمزہ اورالف اورہاعالم ملکوت سے متعلق ہیں اور لام عالم جبروت سے اور واؤعالم ملک سے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وصل:

ارشادربانی ہے:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ (سورۃالنمل: ۳۰)۔

ترجمہ: اللہ کے نام سے ہے جو نہایت مہربان رحم والا۔

اس باب میں اس اسم پر دووجہوں سے گفتگو ہوتی ہے:

ا۔ذات کی وجہ سے۔

۲۔صفت کی وجہ سے۔

جو اسے بدل کہتا ہے وہ ذات مقرر کرتا ہے ،جو اسے نعت کہتا ہے وہ اسے صفت مقرر کرتاہے، جان لو! صفات چھ ہیں، اور انہی صفات کی شرط سے زندگی ہے ،تو کل سات ہوئیں، یہ تمام صفات ذات کے لیے ہیں۔

رحمٰن سے یہی الف۔میم اور نون کے درمیان موجود ہے اور اس اسم پر رسول اللہصلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم کی اس حدیث سے کلام کی ترکیب ہوئی ہے:

"إن اللہ خلق آدم علی صورتہ"۔[25]

”بے شک اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدم کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا“۔

(إن اللہ خلق آدم علی صورۃ الرحمن)۔[26]

”بے شک اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدم کو رحمٰن کی صورت پر پیدا فرمایا“۔

---

[25] قصص الانبیاءالابن کثیر ج ا ص ۹۸

[26] شرح کتاب الناشر: مکتبۃالدار، المدینۃالمنورۃ ج ۲ ص ۴۴

یہ روایت اہل نقل کے طریق پر صحیح نہیں جب کہ اہل کشف کے طریق پر صحیح ہے۔ میں (شیخ ابن عربی) کہتا ہوں کہ الف، لام اور راء علم وارادہ اور قدرت کے لیے ہیں۔ میم اور نون کلام کا مدلول اور سمع وبصر ہیں اور اس کی شرط صفت زندگی ہے جو تمام صفات کے ساتھ ہے۔ (الرحمان میں) الف میم اور نون کے درمیان ہے، یہ مدلو موصوف ہے، اس کے خط کا حذف ہونا موصوف کے ساتھ قیام کی حیثیت سے اس پر دلالتِ صفات کے لیے بدیہی دلالت ہے، عالم کے لے یہ صفات کی جلوہ گری ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کی معرفت اس کی صفات کے بغیر حاصل نہیں کر سکتے۔ اور نہ ہی اسے جان سکتے ہیں۔

پس جو الف کے وجود پر دلالت کرتا ہے ضروری ہے کہ ہم اس کا ذکر کریں اور وہ میم کو کھولنا اور اسے لمبا کرنا ہے۔ یہ ارشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم اور رحمت کشادہ ہے، پس یہ سوائے الف مفتوح کے کبھی نہیں ہو گا، ان مقامات کی مثل میں فتح الف پر دلالت کرتا ہے، جان لو کہ یہ وجودِ روح کا وہ محل ہے جس کا مقام کشادگی کے لیے تجلی کا محل ہے۔

پس اہل علم نے ترکیب کے خطوط وضع کرنے میں اس یاء کا ذکر کیا ہے جس کا پہلا حرف زیر والا ہوتا ہے، کیونکہ یاء صحیح بھی پائی جاتی ہے اور اس سے پہلے کسرہ یعنی زیر آتی ہے۔ ایسے ہی وہ واؤ ہے کہ جس سے پہلے ضمہ یعنی پیش ہوتی ہے۔

اہل علم جب الف کا ذکر کرتے ہیں تو اس کے ماقبل حرف کو مفتوح نہیں کہتے، کیونکہ واؤ اور یاء کے برعکس الف سے پہلے کوئی حرف نہیں، مگر اس پر فتح یعنی زبر ہوتی ہے۔ پس الف کے لیے ہمیشہ اعتدال لازم ہے۔

جاہل آدمی جب وجود میں تمام نقائص سے پاک ہستی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں جانتا تو قدسی اور اعلیٰ ارواح کو بھول جاتا ہے، پس کہتا ہے: وجود میں اللہ تعالیٰ کے سوا اور کچھ نہیں۔ جب اس سے تفصیل پوچھی جاتی ہے تو اس سے اس کا جواب نہیں بن پاتا۔

بے شک اہل علم واؤ کو ماقبل مضموم کے ساتھ اور یاء کو ماقبل مکسور کے ساتھ مخصوص کرتے ہیں، جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ پس الف کے درمیاں اور واؤ اور یاء کے درمیان مفارقت درست ہے۔

الف ذات کے لیے ہے اور واؤ صفات کے لیے اور یاء افعال کے لیے۔ الف روح کے لیے ہے اور عقل اس کی صفت ہے اور وہ مفتوح ہے۔ واؤ نفس کے لیے ہے اور اس کی صفت قبض ہے اور وہ مضموم ہے۔ یاء جسم کے لیے اور وجودِ فعل اس کی صفت ہے اور وہ مکسور ہے۔

واؤ اور یاء سے جو پہلے ہے وہ مفتوح ہو تو مخاطب کے حال کی طرف لوٹتا ہے، کیونکہ دونوں غیر ہیں، پس لازم آیا کہ دونوں پر اختلافِ صفات ہو، کیونکہ الف حرکات کو قبول نہیں کرتا لہٰذا اپنے مدلول کے ساتھ متحد ہو جاتا ہے۔

ان حروف یعنی الف، واؤ اور یاء کو حروف علت کہتے ہیں اور اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں۔ ہم ان کا ذکر پہلے کر چکے ہیں۔ الف وجودِ صفت کے لیے ذاتِ علت ہے اور واؤ وجودِ فعل کے لیے صفتِ علت ہے اور یاء وجود کے لیے فعلِ علت ہے جو اس سے عالم شہادت میں حرکت وسکون سے صادر ہو لہٰذا ان کا فاعل علل رکھا گیا۔

پس الرحمن اسم سے نون نصف دائرہ (ن) کی صورت میں وجود میں آیا اور آخری نصف اس نقطہ میں معقول و محصور ہے جو اس نون غیبیہ پر دلالت کرتا ہے جو نصف دائرہ ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ نقطہ نون محسوسہ پر دلالت کرتا ہے۔

الرحمٰن میں حاء کا پہلا حصہ الف محذوفہ سے ملا ہوا ہے جو اس کے مشاہدہ کی طرف اشارہ ہے اور ساکن ہے اور اگر راء کی طرف اس کا اگلا حصہ ہوتا تو متحرک ہوتا۔ پس پہلا الف علم کے لیے، لام ارادہ کے لیے اور راء قدرت کے لیے اور یہی صفتِ ایجاد ہے۔ پس ہم نے دیکھا کہ الف کے لیے ہمزہ اور راء کے ہونے سے حرکت ہوتی ہے۔ اور لام ساکن ہے۔ پس ارادہ کا قدرت کے ساتھ ہے۔

جب رحمٰن اللہ کے ساتھ واصل ہوا تو قدرت کی راء میں ارادے کا لام مدغم ہو گیا، بعد میں جو راء تھی اس پر شدت آگئی حاء پر تحقیقِ ایجاد کے لیے۔

وجودِ کلمہ ساکن ہے اور اس کا ساکن نہ ہونا تقسیم نہ ہونے کی وجہ سے ہے، جب کہ حرکت منقسم ہوتی ہے۔ اس کا سکون محسوس ہوا اور ہم نے ملاحظہ کیا کہ وہ قدرت کی راء کی مجاور ہے تو ہم نے جان لیا کہ وہ کلمہ ہے۔

اسم رحمٰن اسم اللہ کا بدل ہے

اسم رحمٰن کو اسم اللہ کا بدل کہنے والوں کے قول میں مقام جمع اور اتحادِ صفات کی طرف اشارہ ہے۔ اور یہ مفہوم اس روایت سے حاصل ہوا ہے:

"إن الله خلق آدم علی صورته"۔ [27]

"بے شک اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدم کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا"۔

---

[27] قصص الانبیاء الابن کثیر ج ا ص ۹۸

مقام حق میں بندے کا یہ وجود حدِ خلافت ہے اور خلافت بدیہی طور پر ملک کی استدعا کرتی ہے اور ملک دو اقسام پر منقسم ہے۔

ا۔ پہلی قسم اس کی ذات کی طرف پلٹتی ہے۔

۲۔ دوسری قسم اس کے علاوہ کی طرف لوٹتی ہے۔

ہماری ترتیب کی حد پر اس مقام میں صرف ایک قسم درست ہے، کیونکہ اس مقام پر بدل جس سے بدلا گیا اس کے مقام پر ہے۔ اس کی مثال ہمارا یہ قول ہے:

جاءنی اخوک زید۔

میرے پاس تیرا بھائی زید آیا۔

پس زید، اخوک (تیرا بھائی) سے بدل ہے، جیسا کہ کوئی چیز کسی چیز کا بدل ہوتی ہے، اور ان دونوں کے لیے عین واحدہ ہوتی ہے۔ پس زید تیرا بھائی ہے اور تیرا بھائی بلاشبہ زید ہے۔ یہ ایسا مقام ہے کہ جس نے اس کے خلاف نظریہ رکھا وہ حقیقت سے واقف نہیں اور وہ کبھی بھی موجد کو نہیں پاسکتا۔ جو آدمی اسے نعت کہے تو اس کا اشارہ صفت میں مقام تفرقہ کی طرف ہے اور یہ مقام اس روایت کا حاصل ہے:

(إن الله خلق آدم علی صورة الرحمن)۔[28]

"بے شک اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدم کو رحمٰن کی صورت پر پیدا فرمایا"۔

یہ مقام وراثت ہے اور یہ دو غیروں کے حجاب میں بغیر ایک کے غائب ہونے اور دوسرے کے ظہور پذیر ہونے کے واقع نہیں ہوتا، یہ اس سے بالمجل تعبیر ہوتا ہے۔ ہم نے یہاں اس دلیل کا اقرار کیا ہے جسے پہلے ہم نے پوشیدہ رکھا تھا، پس تجھ پر غور کرنا لازم ہے۔

---

[28] شرح کتاب الناشر: مکتبة الدار، المدینة المنورة ج ۲ ص ۴۴

پس الرحمٰن کا نیچے کا آدھا نون جب ظاہر ہوا تو وہ ہمارے لیے فلکِ دائرے کے نصف دائرہ دسے نصف ظاہر ہوا اور مرکزِ عالم اس خط کے وسط میں ہے جو دوسرے گوشے کی طرف نصف حصہ سے ظاہر ہے، دوسرا نصف حصہ نکتے میں مستور ہے اور وہ ہماری طرف اضافت کے ساتھ نقیضِ خط کے تحت ہم سے غائب ہے، کیونکہ ہمارا دیکھنا ایک طرح سے فعل کی حیثیت رکھتا ہے۔ پس خط میں موجود نصف حصہ مشرق اور نکتہ میں جمع شدہ نصف حصہ مغرب ہے، اور وہ مطلع وجود الا سرار ہے ، پس مشرق ظاہر ہے اور وہ قابلِ تقسیم مرکب ہے اور مغرب باطن ہے اور وہ بسیط ہے اور قابل تقسیم نہیں ہے۔

شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

عجبا للظاھر ینقسم	و لباطنہ لا ینقسم
فالظاھر شمس فی حمل	و الباطن فی اسد جلم
حقق و انظر معنی سترت	من تحت کنائفھا الظلم
ان کان خفی ھو ذاک بدا	عجبا و اللہ ھما القسم
فافزع للشمس و دع قرا	فی الوتر یلوح و ینعدم
و اخلع نعلی قدمی کونی	علمی شفع یکن الکلم

”ظاہر کے لیے تعجب ہے کہ وہ تقسیم ہو جاتا ہے اور اس کے باطن کے لیے بھی تعجب ہے کہ وہ تقسیم نہیں ہوتا۔ پس سورج برج حمل میں ظاہر ہے اور سورج برج اسد میں باطن ہے۔ پس تحقیق سے پوشیدہ معنوں کو دیکھو جو کہ ہونٹوں تلے پوشیدہ ہیں، اگر وہ مخفی ہیں تو وہ ظاہر ہیں، پس دونوں

طرح ہی قابل تعجب ہیں ۔پس سورج کی جستجو کرو اور قمر کو طاق میں رخصت کردو کیونکہ وہ ظاہر اور معدوم ہوتا ہے۔اور پاؤں سے جوتا اتارو اور دو علم میں منقسم ہو جاؤ، دو کلموں بن جاؤ۔“

مراد یہ ہے کہ معلومات کے ساتھ علم اور مرادات میں تقسیم وتعداد واقع ہوتی ہے اور یہ تحریریں نصف حصہ موجود ہیں اور اس اشارہ میں علم وقدرت اور ارادہ سے باطنی اوصاف سے اتحاد اور منزہ ہوناواقع ہوتا ہے۔پس اس پر خوب غوروفکر کرو۔

حاء کے آٹھ عدد ہوتے ہیں اور وہ کمال کا وجود ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم اس سے کلمہ اور روح تعبیر کرتے ہیں، ایسے ہی نون عشرون میں پانچواں ہے کیونکہ میم سے مقدم ہے اور چوتھا ہے۔پس نون جسمانی روح، عقل، نفس اور وجود فعل کے مواد کی ایجاد کا محل ہے اور یہ تمام نون میں ودیعت ہیں اور یہ تمام انسان ہیں، جس کا اظہار ہوا یہ اس کے لیے ظاہر ہوا۔

تتمہ

الف کے ساتھ میم اور نون کے درمیان فصل قائم کی گئی ہے، کیونکہ میم ملکوتیہ ہے، جب ہم نے اسے روح کے لئے مقرر کیاتو وجود کے لئے سب دعویٰ کارازنون ملکوتیہ اور نکتہٗ جبروتیہ ہو گیا، گویا کہ وہ کہتا ہے: اے وہ روح! جو میم کی صورت میں ہے، میں نے تجھے تیری حیثیت سے منتخب نہیں کیا، بلکہ میرے وجودِ علمی میں تیرے لیے عنایت سبقت لے گئی۔

اگر تو چاہتا ہے کہ نکتہ عقل اور نونِ انسانیہ کے لئے اپنے وجود کے واسطے کے بغیر اطلاع پائے تو تجھے چاہیئے کہ اپنے نفس کی معرفت حاصل کر۔ یادرکھو! میرا تیرے ساتھ یہ اختصاص میری اپنی حیثیت سے ہے نہ کہ تیری حیثیت سے۔ پس اگر یہ انتخاب درست ہے تو پھر اس کے غیر کے لئے کبھی بھی تجلی درست نہیں ہو گی۔ ان میں سے جو اولیٰ ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا ہوں۔

اے مسکین! یادرکھ! وجودِ میم میں تقدم کے باوجود دائرہ جو ہے وہ تو جسم کی صورت پر ہے۔ اس کے ساتھ تقسیم سے تنزیہہ کی طرف کیسے اشارہ ہے۔ دائرہ کی تقسیم لامتناہی ہے اور روحِ میم کی تقسیم اس کی معلومات کے ساتھ لامتناہی ہے اور وہ بنفسہ نہیں ہوتا۔

یادرکھو! میم علیحدہ ہوتی ہے، تب پھر اس سے مادہ تعریق کیسے ظاہر ہوگا، اس لیے کہ عالمِ خطاب وتکلیف میں وجود ہمیشہ فعل کی طرف نزول کرتا ہے تو مادہ اپنی ذات کے حق میں نہیں ہوتا بلکہ دوسری کے حق میں ہوتا ہے۔ جب اس پر دائرہ بطور خاص دلالت کرتا ہے تو جو زائد ہے وہ اس کے حق میں نہیں ہے۔ پس جب عبد کی نظر مادہ کی طرف ہوتی ہے تو تعریق طویل ہوجاتی ہے اور یہ وہ تحقیق ہے جو وجود کے متعلق ہے۔

آسمان وزمین کارب۔۔۔۔الرحمٰن

الرحمان میں میم اور نون کے درمیاں جزء متصل ہے اور وہ ذات کا مرکز الف ہے۔ یہ الف میم اور نون کے درمیان مادہ کے طریق کے ساتھ اتصال واقع کرنے کے لیے آیا ہے، پس الف پوشیدہ ہوگیا اور وہ جزء متصل ہوگئی (پس الرحمٰن پڑھا لکھا گیا) اگر الف ظاہر ہوتا تو میم کے لیے دائرہ درست نہ ہوتا کیونکہ الف دونوں کے درمیان حائل ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے تنبیہ کی گئی ہے:

رَبِّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَابَيْنَهُمَا الرَّحْمَنِ (سورۃالنباء:۳۷)۔

ترجمہ: وہ جو رب ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے رحمٰن۔

مراد کے الف کا وجود ظاہر کرنے والے کا مبتدا ہے، یہ ترتیب کے اعتبار سے صحیح نہیں۔ البتہ رب کا بدل رحمٰن کو ظاہر کرنا درست ہے۔ یہاں الف روح سے عبادت ہے، وہ باقی ہے اور حق کے

ساتھ قائم ہے۔ میم آسمان اور نون زمین ہے اور جب الف۔ میم اور نون کے درمیان ظاہر ہوتا ہے تو میم کے ساتھ اس کا اتصال ہوتا ہے، نون کے ساتھ نہیں ہوتا۔ پس اسے قطع کرنے کے لیے نون کے بغیر واسطے کے صفت نہ بنائیں، البتہ میم کے ساتھ اس کا اتصال بلا واسطہ اخذ کرنے پر دلیل ہے، ہاں قطع کے ساتھ اس کا عدم بھی صحیح ہے۔ اس میں نون فنا ہو جاتا ہے اور میم اس کے درمیانی نقطہ کے ساتھ اس کے سرِ قدم سے محبوب باقی رہتا ہے، یہی نظر کے ساتھ اس کی ذات کی طرف دائرہ کا درمیان ہے، یہ معاملہ اس کے بعد ہے کہ وہ اس کے لیے ظاہر نہیں تھا۔

السوال: کیا آپ نے اپنے سرِ قدم کو جان لیا اور اس نے نہ جانا۔ اگر آپ اپنے ظاہر کی طرف دیکھیں تو وہ اسے جاننے کا آپ سے زیادہ مستحق ہے یا کیا سرِ قدم کے عالم میں وہ معنیٰ موجود ہیں جس میں آپ کلام کرتے ہیں اور وہ روحِ میم ہے جو اپنے سرِ قدم پر واقف ہے۔

الجواب: جواب یہ ہے کہ ہم سے سرِ قدم کو جاننے والا وہ ہے جسے وہاں ہم سے پردے میں رکھا گیا ہے، جس وجہ سے ہم اس کا علم ثابت کرتے ہیں وہ اس کے علاوہ ہے جس سے ہم اس کے لیے عدمِ علم ثابت کرتے ہیں۔ یقیناً سے علم سے حاصل ہے نہ کہ آنکھ سے۔ وہ موجود ہے تو کسی چیز کے جاننے کے لیے یہ شرط نہیں کہ اسے دیکھا بھی جائے۔ البتہ دیکھنا اس کی معرفت کو کامل اور علم زیادہ واضح کر دیتا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ ہر عین علم ہے اور ہر علم عین (دیکھنا) نہیں ہے، کیونکہ دیکھنا علم کی شرط نہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ مکہ مکرمہ کو جاننے والے نے مکہ مکرمہ کو دیکھا بھی ہو۔ ہم قطعی طور پر یہ کہتے ہیں کہ مکہ مکرمہ کو جاننے سے مراد اس کے نام کو جاننا نہیں۔ پس عین کے لیے علم تو معلوم کے درجہ میں ہوا۔

جیسا کہ شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

ولکن للعیان لطیف معنی
لذاسال المعاینۃ الکلیم

"یقیناً دیکھنے میں لطیف معانی پوشیدہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ کلیم اللہ نے دیکھنے کا سوال کیا۔"

ہم تو کہتے ہیں کہ سرِ قدم کی حقیقت تو حق الیقن کے درجہ میں ہے کیونکہ اسے دیکھا نہیں جاسکتا، پس اپنے موجد کی ذات کی طرف رجوع کرنے والا مشاہدہ نہیں کر سکتا، اگر اپنے بنانے والے کی ذات کو جانتا ہے تو اس کے حق میں نقصان ہے، پس مخلوق کا کمال اس میں ہے کہ اپنے نفس کی معرفت حاصل کرے۔ پس یہ عین نہ ہوا۔ اس فصل کی باتیں قابل تعجب ہیں، پس اس پر غور کر۔ پس غور کر کیونکہ غور کرنے سے عجائبات پر واقف ہو جائے گا۔

تکملہ

الرحمٰن میں لام کا راء کے ساتھ متصل ہونا اس بات کی علامت ہے کہ اتصال اور اتحادِ نطق کی حیثیت سے دونوں میں دو باطنی صفات ہیں۔ پس دونوں پر اتحاد آسان ہوا اور حاء، راء منفصلہ کے لیے اس کے مقدر ہونے کی وجہ سے تعبیر ہوتی ہے۔

قدرت سے یہ امتیاز مقدر کے لیے قدرت ہے۔ ہو سکتا ہے ہ کہ مقدر حاء کو یہ وہم ہوا ہو کہ وہ ذاتِ قدرت کی صفت ہے۔ پس قدیم اور محدث کے درمیان فرق واقع ہو گیا۔ پس اس پر غور کر، اللہ تعالیٰ تجھ پر رحم فرمائے۔

رحمٰن ذات کا اسم ہے

یادرکھو!رحمٰن اسم ہے اور یہ ذات کا اسم ہے۔اس سے پہلے جو الف لام آیا ہے وہ تعریف کے لیے ہیں، یہ دونوں حرف صفات ہیں، یہی وجہ ہے کہ انہیں زائل کرکے الرحمٰن کے بجائے رحمان کہا گیا۔الف لام دونوں کے شروع میں آنے کی وجہ سے یہ صفت ہے، اسم نہیں۔

مسیلمہ کذاب کے نام پر غور کرو، اس کا نام رحمٰن تھا اور اسے الف لام ہدایت نہیں ہوئی تھی ، کیونکہ ذات ہر ایک کے لیے محلِ دعوی ہے اور مدعی صفات کے ساتھ رسوا ہوتا ہے۔پس رحمان مقام جمع ہے اور یہ مقام جہل ہے۔

اللہ کی راہ کی طرف ترقی کے لیے سب سے بہتر اللہ سے انجان ہونا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کو نہ جاننا اور اس کی معرفت حاصل نہ کرنا ہے، کیونکہ عبودیت کی حقیقت ہی یہ ہے کہ بندہ اللہ کی قدرتوں کے بارے میں معرفت حاصل کرے، نہ کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں اپنے دماغ کو شیطانی خیالات کی آماجگاہ بنالے۔

رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَأَنْفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُمْ (سورۃالحدید:۷)۔

ترجمہ: اور اس کی راہ (میں) کچھ وہ خرچ کرو جس میں تمھیں اَوروں کا جانشین کیا۔

پس یہ تمہاراانجان پن ہے اور اس کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے:

وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا (سورۃبنی اسرائیل:۸۵)۔

ترجمہ: اور تمہیں علم نہ ملا مگر تھوڑا۔

رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ (سورۃالبقرۃ:۱۲۱)۔

ترجمہ: جنہیں ہم نے کتاب دی ہے وہ جیسی چاہیے اس کی تلاوت کرتے ہیں۔

پس مسیلمہ ،شیطان اور دجال سے خلافت کی حقیقت سلب ہوگئی اور ان کا وہی حال ہے جو ہے ۔اگر ان کا استحقاق ذاتی ہوتا تو ان سے یہ چیز ہر گز سلب نہ ہوتی لیکن اگر عین تنقید اور قبول کلی کے ساتھ دیکھیں نہ کہ امر کی آنکھ سے تو آپ مخالف کو اطاعت گزار اور ٹیڑھے کو سیدھا دیکھیں گے اور سبب کو طوعاًوکرہاًاطاعت میں پائیں گے۔

شیطان اور مسیلمہ نے عبودیت کو تصریحاً تسلیم کیا،جبکہ دجال نے انکار کیا۔پس غور وفکر کر کہ ان میں سے ہر ایک نے کہاں سے کلام کیا اور ان کے لیے کون سے حقائق ظاہر ہوئے،یہاں تک کہ ان کے لیے یہ احوال لازم ہوگئے۔

تتمہ

جب ہم اللہ تعالیٰ کے ارشاد:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کو پڑھتے ہیں تو(اللہ،الرحمٰن،الرحیم میں)الف اور لام کا وجود ظاہر نہیں ہوتا(بلکہ اللہ کا دوسرا لام پڑھا جاتا ہے،الرحمٰن کی ابتداء راء سے ہوتی ہے اور اسی طرح الرحیم کی۔)پس یوں ذات کا اتصال ذات سے ہوگیا۔

اللہ اور رحمان اسم ذات

اللہ اور رحمٰن ذات کے دو اسم ہیں۔یہ اس کی ذات کے ساتھ ذات کی طرف رجوع ہے،یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم نے عرض کیا:

اعوذبک منک

ترجمہ:میں تجھ سے تیرے ساتھ پناہ مانگتا ہوں۔

اعوذبک۔

ترجمہ: میں تیری پناہ مانگتا ہوں۔

منک

ترجمہ: میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں۔

منک وہ ہے جس پر اعوذ دلالت کرتا ہے اور اسے علیحدہ کرنا درست نہیں، کیونکہ وہ ذات میں ہے اور اس میں تفصیل جائز نہیں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ کلمۃ اللہ عبد ہے، جیسا کہ اللہ کا لفظ ذات کے لیے دلیل ہے ایسے ہی عبد کا لفظ جامع کلی ہے، پس "عبدہ" (اس کا بندہ) کلمہ جلالت ہے۔

ما انا اللہ

ترجمہ: میں نہیں ہوں۔ بس اللہ ہے۔

اور بعض صوفیاء نے دو مختلف مقامات سے بھی کہا ہے۔ پس معنی کے مقام اور حرف کے اس مقام میں فرق ہے جس میں وہ معنی پایا جاتا ہے۔ پس اس نے حرف کو حرف کے مقابل کیا کہ میں میری رضا کے ساتھ تیری ناراضگی سے پناہ مانگتا ہوں اور معنی کو معنی کے بالمقابل کیا کہ تجھ سے تیرے ساتھ پناہ مانگتا ہوں۔ یہ جملہ انتہائے معرفت کی دلیل ہے۔

خاتمہ

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاعْبُدُوا اللَّهَ (سورۃالنساء: ٣٦)۔

ترجمہ: اور اللہ کی بندگی کرو۔

تو کفار نے یہ نہیں کہا کہ اللہ کون ہے؟ کیا ہے؟

لیکن ان کے نزدیک اللہ اور رحمٰن میں فرق تھا، یہی وجہ ہے کہ جب کفار سے کہا گیا:

اسۡجُدُوا لِلرَّحۡمَنِ۔(سورۃالفرقان:۶۰)

ترجمہ: رحمٰن کو سجدہ کرو۔

تو کفار نے کہا:

وَمَاالرَّحۡمَنُ۔(سورۃالفرقان:۶۰)

ترجمہ: رحمٰن کیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ایک جماعت کے نزدیک نعت بدل سے بہتر ہے اور دوسرے کے نزدیک نعت سے بدل بہتر ہے۔

رب تعالیٰ کا فرمان ہے:

قُلِ ادۡعُوا اللّٰهَ أَوِ ادۡعُوا الرَّحۡمَنَ أَيًّا مَا تَدۡعُوا فَلَهُ الۡأَسۡمَاءُ الۡحُسۡنَى(سورۃ بنی اسرائیل:۱۱۰)۔

ترجمہ: تم فرماؤ اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر جو کہہ کر پکارو سب اسی کے اچھے نام ہیں۔

پس اسم اللہ، اللہ کی ذات کے لیے ہے اور عرب والوں نے اس کا انکار نہیں کیا، جبکہ اسم رحمٰن پر انہوں نے اعتراض کیا۔ وہ اسم اللہ ک قائل تھے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے:

مَانَعۡبُدُهُمۡ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَاإِلَى اللّٰهِ زُلۡفَى (سورۃالزمر:۳)۔

ترجمہ: کہتے ہیں ہم تو انہیں صرف اتنی بات کے لیے پوجتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے پاس نزدیک کردیں۔

پس وہ اللہ کو جانتے تھے، جب رحمٰن کا اسم آیا تو وہ پریشان ہو گئے، رحمان رحمت سے مشتق ہے اور انسان میں بھی صفت رحمت موجود ہے، یہی ان کے خوفزدہ ہونے کی وجہ تھی، کہ کہیں رحمٰن ان

کی جنس سے نہ ہو،یہی وجہ ہے کہ انہوں نے انکار کیا اور کہا کہ رحمٰن کیا ہے؟ پس ہر کلام کے معنی کو سمجھنا شرط نہیں،اسی لیے فرمایا:

قُلِ ادْعُوا اللّٰہَ أَوِ ادْعُوا الرَّحْمَنَ (سورۃ بنی اسرائیل: ۱۱۰)۔

ترجمہ: تم فرماؤ اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر۔

پس یہ دونوں لفظ اللہ اور رحمین ایک ہی ذات کی طرف پلٹتے ہیں،اور یہ بندے کو سمجھانے کے لیے ہیں،اللہ تعالیٰ یقیناً ادراک وتوہم سے اور محدود ومحیط علم سے منزہ ہے۔

الرحیم کی وضاحت۔۔۔الاسماء اور جوامع الکلم

وصل:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں لفظ رحیم آیا ہے اور رحیم تو رسول خاتم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم کی صفت بھی ہے۔جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ (سورۃ التوبۃ: ۱۲۸)۔

ترجمہ: مسلمانوں پر کمال مہربان مہربان۔

رحیم کے ساتھ کمالِ وجود ہے اور اس لفظ سے بسم اللہ مکمل ہوگئی،اس کے ساتھ خلق وابداع کا جہاں بھی مکمل ہوگیا۔پس رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم وجودِ عالم کا عقلاً ونفساً مبتداء ہیں،آپ جہاں سے پہلے پیدا کیے گئے۔چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم نے فرمایا:

كنت أول النبيين في الخلق وآخرهم في البعث۔

كنت نبياً وآدم بين الماء والطين۔[29]

[29] شرح سنن الترمذیج ۱ ص ۹۳۔

”میں اس وقت بھی آخری نبی تھا جبکہ سیدنا آدم پانی اور مٹی کے درمیان تھے“۔

رحیم سے وجودِ باطن کی ابتداء ہوئی اور رحیم کے ساتھ ہی عالمِ منقوش میں ظہورِ اختتام کو پہنچا۔

چنانچہ فرمایا:

لا رسول بعدي و لا نبي۔[30]

ترجمہ: نہ ہی کوئی رسول میرے بعد آئے گا اور نہ ہی نبی۔

پس بسم اللہ کی ابتداء اور انتہاء کو اگر ظہور کے اعتبار سے دیکھیں تو بسم (ابتداء) سے مراد اگر سیدنا آدم علیہ السلام ہیں تو رحیم (اختتام) سے مراد حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ و اصحابہ وبارک وسلم سے مراد حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم ہیں۔ مقامِ ابتداء سیدنا آدم علیہ السلام ہیں اور مقامِ انتہاء سیدنا محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک و سلم ہیں۔ سیدنا آدم علیہ السلام حاملِ اسماء ہیں، اسی لئے وہ گویا بسم ہیں۔ چنانچہ ارشادِ ربانی ہے۔

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا (سورة البقرة: ۳۱)۔

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام اشیاء کے نام سکھائے۔

سیدنا آدم علیہ السلام جن اسماء کے حامل تھے، رسولِ خاتم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم ان اسماء کے معانی کے حامل تھے اور یہی اسماء اور ان کے معانی جوامع الکلم ہیں۔ چنانچہ رسولِ خاتم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم نے فرمایا:

أُعْطِيتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ۔[31]

مجھے جوامع الکلم عطا فرمائے گئے۔

---

[30] سنن الترمذي ج۴ ص ۵۳۳۔

[31] السنن الكبرى وفي ذيله الجوهر النقي ج ۲ ص ۳۰۲۔

کسی نے اپنی ذات کی ایسی کمال تعریف نہیں کی کہ جس سے اس کی ذات کامل ہو جائے جیسی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم نے کی ہے حتیٰ کہ سیدنا یحییٰ وسیدنا عیسیٰ علیہما السلام نے بھی اپنی ایسی کمال تعریف نہیں کی۔

جسے اسماء کی معرفت حاصل ہو جائے اسماء اس کے حکم کے ماتحت ہوتے ہیں، ایسا کوئی آدمی نہیں ہے کہ جسے اسماء تو حاصل ہو جائیں اور مسمی کو بھی وہ حاصل کر لے۔ یہ فرق ہم میں اور صحابہ کرام علیہم الرضوان میں ہے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم کی ذات کو حاصل کیا یعنی مسمی کو اور ہم نے اسم کو۔ وہ صاحبِ فضیلت تھے کہ انہیں ذات حاصل تھی۔ جب ہم نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم کے نام مبارک کا وہی احترام کیا جو ذات کا کیا جاتا تھا تو ہمارے لئے وہ دوہرا اجر ثابت ہو گیا۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم کے غائب ودوری کی حسرت میں نہیں جلے، جبکہ ہمیں حضور ﷺ کی دوری اور ہجر، کا غم سہنا پڑا، پس ہم بعد میں آنے والوں کو اجر پر اجر ملا۔ ہم اخوان یعنی بھائی بنے اور وہ اصحاب یعنی دوست، رسول اللہ ﷺ کو ہمیشہ ہمیں (بعد میں آنے والے امتیوں) کو ملنے کا شوق تھا۔ آپ ﷺ کو ہم میں سے کسی سے ملاقات کی خوشی کیوں نہ ہوتی جبکہ آپ کو جس کا شوق ہو تا وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا تو کیا اس کرامت اور بزرگی کو کسی اور آدمی پر قیاس کیا جا سکتا ہے؟ ہم میں سے با عمل لوگوں کے لیے پچاس نیکیوں کا اجر ہے جو کہ آپ کے زمانے کے لوگوں کو حاصل تھا، یہ اعیان نہیں بلکہ امثال ہیں۔

یہ مفہوم رسول خاتم ﷺ کی حدیث سے اخذ ہو تا ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا:

بل منکم

ترجمہ: بلکہ وہ تم میں سے ہیں۔

پس صحابہ نے جدوجہد کی یہاں تک کہ وہ اس بات تک پہنچ گئے کہ ان کے بعد ایسے لوگ آئیں گے جو اگر رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو دیکھ لیتے تو وہ ہم یعنی صحابہ سے حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے معاملے میں سبقت لے جاتے۔ یہاں مجازات واقع ہوئے (غیر صحابی کو جو فضیلت حاصل ہے وہ مجازی ہے جبکہ صحابی کی فضیلت حقیقی ہے) اور اللہ ہی مدد فرمانے والا ہے۔

تسمیہ کے چار الفاظ

تنبیہ:

یاد رکھو! بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے چار الفاظ ہیں اور ان کے لیے چار معانی ہیں، پس یہ کل آٹھ ہوئے۔ یہی آٹھ عرش کے حامل ہیں اور ان کا تعلق عرش سے ہے، وہ ایک وجہ سے حاملانِ عرش ہیں اور ایک وجہ سے عرش ہیں۔ پس تجھے اس پر غور کرنا چاہیے، آپ کی ذات کے لیے آپ سے اخراج ہے۔

تنبیہ:

پھر ہم نے بسم اللہ میں بسم اللہ کی اس میم کی طرف توجہ کی جو کہ سیدنا آدم کی میم کا عرق ونچوڑ ہے اور ہم نے رحیم کی میم کی طرف بھی توجہ کی جو کہ سیدنا محمد رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی میم کا عرق ونچوڑ ہے، یہ عموماً خطابِ وجود کے لیے ہوتی ہے۔ سیدنا آدم بھی ہمارے پاس (ایک وقت اس دنیا میں) تھے، لہٰذا دونوں میم لمبے ہوتے ہیں۔

انتباہ

ہمارے سردار رسول خاتم ﷺ نے کبھی بھی اپنی خواہش نفس سے کلام نہیں فرمایا، پس آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

ان صلحت امتی فلھا یوم وان فسدت فلھا نصف یوم۔

(اسرار التسمیۃ والفاتحۃ)

"اگر میری امت صالح ہو گی تو اس کے لیے ایک دن ہو گا۔ اور اگر فساد کرے گی تو نصف دن ہو گا۔"

پس یہاں دن سے مراد اللہ کے ہاں کا دن ہے، اور اللہ کے ہاں کا ایک دن ہمارے ایک ہزار نورانی سالوں کے برابر ہے بخلاف ایام ذی المعارج اور ایام اللہ کے۔ ان دونوں کا فرق ایام سے بڑا ہے، پس بے شک اگر اللہ نے چاہا تو اس کا ذکر آگے (فتوحات مکیہ کے) اس باب میں آئے گا جس کا عنوان ہے: معرفت زمان واصلاح امت۔

امت کی اصلاح حضور ﷺ کی نظر کے مطابق ہے اور امت کا فساد اس سے اس کی اعراض کے ساتھ ہے۔ پس یوں ہم نے بسم اللہ کو ہزار معنوں پر مشتمل پایا اور ہر معنے کا حصول ایک سال پورا ہونے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ ان معانی کا حصول لازماً بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو شامل ہے کیونکہ وہ اپنے معنی کے اظہار کے لیے عطا کی گئی ہے۔

پس لازم ہے کہ ہزار سال کامل ہوں اور یہ میزان میں پہلا دورہ اور اس کی مدت چھ ہزار سال روحانی محقق ہوتی ہے۔ اس امت پر وہ علوم الٰہیہ ظاہر ہوئے جو ان کے علاوہ کسی اور امت کے لیے ظاہر نہیں ہوئے تھے کیونکہ وہ دور گزر چکا ہے جو مٹی کا دور تھا، پس ان کے علم کی غایت طبائع تھی اور ان میں علم الٰہیات کے جاننے والے بہت قلیل تھے۔ پس یہ بھی ممکن تھا کہ ان کے لیے عین کا

ظہور ہی نہ ہوتا۔ پھر اگر کوئی ان میں سے عالم ہوتا تو وہ طبیعات کے ساتھ ملا ہوا ہوتا،اور یہ ضروری بھی تھا۔ ہمیں جو علم حاصل ہوا ہے وہ خالص الٰہیات سے ہے،اس میں علم طبائع کا کوئی حصہ شامل نہیں۔

اللہ اور رحمان کا الف

پھر ہم نے توجہ کی تو اللہ اور رحمیں میں دو الف تھے،ایک الف ذات کے لیے اور ایک الف علم کے لیے۔ذات کا الف پوشیدہ ہے اور علم کا الف عالم پر تجلی صفت کے لیے ظاہر ہوا،پھر یہ بھی اللہ میں پوشیدہ ہو گیا اور اللہ الا اللہ کے درمیان خط میں رفعِ شک کے لیے ظاہر نہ ہوا۔

ہم نے باسم میں لفظ آدمی کی طرح ایک الف پایا،جو باء کے ظہور کے لیے پوشیدہ ہوا اور الرحیم میں ایک الف پایا جو خاتم المرسلین محمد رسول ﷺ کی طرح ظاہر ہے اور یہ الف علم ہے اور خاتم المرسلین ﷺ کے لیے نفس ذات پس آدم میں الف پوشیدہ ہو گیا کیونکہ وہ کسی کی طرف نہیں بھیجے گئے تھے اور ان کے ظہور صفت کی ضرورت نہیں تھی،اور خاتم المرسلین محمد ﷺ کی ذات اقدس میں وہ الف ظاہر ہوا کیونکہ آپ بھیجے گئے تھے اور آپ ﷺ نے تائید طلب کی تھی،پس آپ کو الف عطا کیا گیا جو کہ الرحیم میں ظاہر ہوا۔

بسم اللہ کی باء

ہم نے دیکھا کہ بسم اللہ کی باء الرحیم کی میم میں عمل کرتی ہے،پس اسی طرح خاتم المرسلین محمد رسول اللہ ﷺ کے وجودِ ترکیب نے سیدنا آدم میں عمل کیا اور لفظ اللہ پر داعی ہونے کے سبب اور

رحمٰن میں مدعو ہونے کے سبب عمل کیا۔ جب ہم نے دیکھا کہ ہدایت اشرف وافضل ہے تو ہم نے کہا:

من عرف نفسہ فقد عرف ربہ۔ (رسالہ قشیریة)

"جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کی معرفت حاصل کرلی"۔

اسم مسمی کی طرف جانے کا زینہ وسیڑھی ہے، جب ہم نے جان لیا کہ لفظ بسم کی روح کا لفظ الرحیم کی روح میں عمل ہے، نبی کریم ﷺ اس وقت بھی نبی تھے جبکہ سیدنا آدم پانی اور مٹی کے درمیان تھے۔ اگر یہ دونوں چیزیں نہ ہوتیں تو سیدنا آدم کا نام آدم نہ ہوتا۔ چنانچہ نے جان لیا کہ بسم ہی وہ رحیم ہے کیونکہ کوئی چیز عمل نہیں کرتی مگر یہ کہ اس کی ذات ہونہ کہ اس کا غیر، پس نہایت وہدایت اور شرک وتوحید معدوم ہوگئے اور اتحاد اور اس کی سلطنت کا ظہور ہوگیا۔ پس خاتم المرسلین ﷺ جمع کے لیے اور سیدنا آدم تفریق کے لیے ہیں۔

اسی کی دلیل یہ ہے کہ الرحیم کا الف العلم کا الف ہے، چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔

وَلَا خَمْسَةٍ إِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ (سورۃ المجادلة:۷)

ترجمہ: اور کوئی پانچ نہیں ہوتے مگر یہ کہ ان کا چھٹا اللہ ہوتا ہے۔

بسم کی الف مین بھی علم کا الف ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

مَا يَكُونُ مِنْ نَجْوَى ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ (سورۃ المجادلة:۷)۔

ترجمہ: جہاں کہیں تین شخصوں کی سرگوشی ہو تو چوتھا وہ (اللہ) موجود ہے۔

پس الف ہزار ہے، اس سے توحید کا باطن کم ہے اور نہ ہی اس کے ظاہر کی مراد زیادہ ہے۔ پس جب بسم میں لفظ آدم کا الف پوشیدہ ہوگیا جو کہ پہلے موجود تھا اور اس کے مقام پر اس کا کوئی مدعی اور جھگڑا کرنے والا نہ تھا اور وہ پہلی ہی نظر میں اپنے موجد کے وجود پر دلالت کرتا ہے، اس لیے وہ

ہمارے وجود کو فتح کرنے کا مقام ہے کیونکہ جب اس نے اپنے وجود میں دیکھا تو اس کے لیے دو امروں میں تعارض کیا ایک یہ کہ اسے ایسے وجود میں پیدا کیا جس کا اول نہیں، دوسرا یہ کہ وہ اپنے آپ کو خود پیدا کرنے والا ہے، پس یہ تو محال ہے کہ وہ خود کو خود پیدا کرے کیونکہ یہ امر اس بات سے خالی نہیں کہ وہ اپنے آپ کو پیدا کرتا ہے تو خود ہی موجود ہو یا یہ کہ وہ خود کو پیدا کرے اور وہ خو معدوم ہو، اگر موجود تھا تو اس نے کیسے پیدا کیا اور وہ معدوم تھا تو اس نے کسے پیدا کیا، تو کیا اس کا پیدا کرنا درست ہو سکتا ہے جو کہ خود معدوم ہے؟ اب اس کے سوا کوئی امر باقی نہیں رہتا کہ اسے کسی دوسرے نے پیدا کیا ہے اور وہ الف ہے، اس لیے بسم کا الف ساکن ہے اور وہ عدم ہے اور میم متحرک ہے اور وہ دورِ ایجاب ہے۔

جب اس تخلیق کی پہلی نظر میں ہی دلالت ہوگئ تو قوتِ دلالت کے لیے الف پوشیدہ ہو گیا اور ضعفِ دلالت کے لیے الرحیم میں رسول خاتم ﷺ کے لیے وجود منازع کے لیے ظہور ہوا۔ الف کے ساتھ اس کی تائید ہوئی اور رحیم رسول خاتم ﷺ کے لیے ہو گیا، پس اس کے اسم ظاہر سے الف اس کے لیے اس سے حق کی تائید ہو گیا۔

چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔

فَأَصْبَحُوا ظَاهِرِينَ (سورۃ الصف: ۱۴)۔

ترجمہ: تو غالب ہو گئے۔

اور فرمایا:

قولو الا الہ الا اللہ وانی رسولہ۔

ترجمہ: ”کہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اس کا رسول ہوں“۔

پس جو آپ ﷺ کے صرف الفاظ کے ساتھ ایمان لایا تو وہ شرک کے خول سے نکل نہیں سکا ،اگر چہ اس کے لیے جنت ہے۔ اور جو آپ کے الفاظ کے معانی پر ایمان لایا تو اس کے لیے ہی تو آٹھوں جنتیں ہیں، جو ذات پر ایمان لایا وہ دوسرے کے میزان میں نہیں ہوتا کیونکہ یوں برابری اقع ہو جاتی ہے اور پسندیدگی کا اتحاد اور رسالت کا اختلاف جمع ہو جاتے ہیں۔

بسم، رحمٰن اور رحیم کے نقطے۔۔۔ لفظ آدم۔۔۔۔ نبی خاتم اور یاغار.

ہم نے دیکھا کہ بسم اور رحمان میں ایک ایک نقطہ ہے اور الرحیم میں دو نقطے ہیں، اور لفظ اللہ کو دیکھا تو وہ خاموش تھا یعنی اس پر کوئی نقطہ نہیں، اس لیے کہ وہ اسم ذات ہے اور باقی سب اسماء میں محلِ صفات ہونے کی وجہ سے نقطوں والے ہیں۔ پس یوں لفظ بسم اور آدم میں اتحاد ہو گیا کیونکہ سیدنا آدم فردِ واحد ہیں اور کسی کی طرف بھیجے نہیں گئے۔ رحمان میں اتحاد ہوا کیونکہ وہ لفظ آدم کی مثل ہے۔ (بلا مثال و تمثیل اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہے) یونہی لفظ آدم کائنات کے مرکبات کے عرش پر مستوی ہے۔

باوجود الف کے ظہور کے رحیم کے نقطوں پر کلام باقی رہتا ہے، پس یاء دس راتیں ہیں، دونوں نقطے جفت اور الف وتر و طاق ہے۔ اسم کلیہ کے ساتھ واقع ہوا ہے اور فجر اس کے باطنِ جبروتی کا معنی ہے اور چھپانے والی رات غیب ملکوتی ہے۔

رحیم کی دونوں نقطوں کی ترتیب ایک میم سے ملی ہوئی ہے اور ایک الف سے۔ میم سے مراد وجودِ عالم ہے جو ان کی طرف مبعوث ہوا ہے اور جو لفظ اس سے متصل ہے وہ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں اور جو نقطہ الف سے ملا ہوا ہے وہ سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ ہیں اور دونوں پر یاء کا غار کی

طرح نقاب ہے(نبی کریم ﷺ کا تعلق براہ راست رب تعالیٰ سے ہے اور سیدنا ابو بکر کا تعلق نبی کریم ﷺ سے ہے اور یہ دونوں ہستیاں ہجرت کی رات غار ثور میں پوشیدہ ہوئیں تاکہ کفار سے نجات ملے،سیدنا ابو بکر کفار کے قریب آنے سے خوفزدہ ہوئے)چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔

إِذْيَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا (سورۃالتوبۃ:۴۰)۔

ترجمہ:جب اپنے یار سے فرماتے تھے غم نہ کھا بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

رسول اللہ ﷺ سیدنا ابو بکر کی صداقت سے واقف تھے،اور رسول اللہ ﷺ اس حال میں حق سے واقف تھے جس میں آپ اس وقت تھے،پس آپ وﷺ حکیم تھے جیسا کہ ثابت ہے کہ آپ نے دعاوالحاح سے کام لیا۔جبکہ سیدنا ابو بکر اس مقام پر پریشان ہوکر کفار کے آنے کو محسوس کرکے بے تاب ہوگئے۔

حکیم مواطن میں حق ادا کرتا ہے۔جب کہ دو سچوں کا اس کے ساتھ اجتماع درست نہیں،اس لیے سیدنا ابو بکر حضور ﷺ کے مقام میں قائم نہ رہ سکے جبکہ صدق میں آپ کے ساتھ قائم تھے، پس اس مقام میں حضور ﷺ سے اگر نعوذ باللہ (معرفت و قرب الٰہی کا) فقدان ہوتا تو حضرت ابو بکر اس مقام میں قائم رہتے جس میں حضور ﷺ قائم تھے کیونکہ اس مقام پر رسول اللہ ﷺ سے کوئی اعلیٰ وبلند نہ تھا جو انہیں اس سے روک لیتا(اس لیے آپ ﷺ مقام قرب میں قائم رہے اور سیدنا ابو بکر اس مقام سے پیچھے ہی رہے،البتہ مقام صدق میں وہ حضور ﷺ کے ساتے تھے۔)

پس اس وقت آپ ﷺ صادق اور اس مقام کے حکیم تھے اور آپ ﷺ کے سوا جو بھی تھا وہ آپ کے حکم کے ماتحت تھا۔پس جب سیدنا ابو بکر کے نقطہ نے طالبوں کی طرف دیکھا تو اس پر تاسف کیا اور شدت ظاہر کی اور صدق غالب آگیا تو حضور ﷺ نے فرمایا:اس تاسف کے اثر سے غم نہ کھانا کیونکہ:

إِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (سورۃ التوبۃ: ۴۰)۔

ترجمہ: بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

اگر اس میں نزاع واختلاف پیدا ہو کہ حضور ﷺ اس کے قائل ہیں تو بھی کوئی حرج نہیں ،اس لیے کہ حضور ﷺ کا مقام جمع و تفرقہ تھا اور آپ ﷺ سیدنا ابو بکر کے افسوس کو جانتے تھے اور الف کی طرف نظر کرتے ہوئے آپ ﷺ نے سیدنا ابو بکر کے افسوس کی طرف نظر کی اور تائید کی۔ آپ ﷺ نے جان لیا کہ یہ معاملہ قیامت کے دن تک ہمیشہ رہے گا پس فرمایا:

إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (سورۃ التوبۃ: ۴۰)۔

ترجمہ: جب اپنے یار سے فرماتے تھے غم نہ کھا بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

یہ وہ اعلیٰ اور افضل مقام ہے جس تک انسانی عروج کی انتہا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے پہلے بیان فرمایا جس کے متعلق آپ ﷺ نے فرمایا:

''میں نے کوئی چیز نہیں دیکھی مگر میں نے اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کو دیکھا۔''

سیدنا ابو بکر کا مشاہدہ وراثت محمدی ﷺ تھا اور لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے ئ فرمایا:

من عرف نفسہ فقد عرف ربہ۔

ترجمہ: ''جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کی معرفت حاصل کرلی''۔

ایک اور قول کی اللہ تعالیٰ نے ہمیں خبر دی ہے، چنانچہ فرمایا:

قَالَ كَلَّا إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ (سورۃ الشعراء: ۶۲)۔

ترجمہ: ''جس موسیٰ نے فرمایا یوں نہیں بے شک میرا رب میرے ساتھ ہے وہ مجھے اب راہ دیتا ہے''۔

(پس سیدنا موسیٰ نے جمع کا صیغہ نہیں بولا اور اپنے ساتھیوں شامل نہیں کیا جبکہ نبی کریم ﷺ نے جمع کا صیغہ بول کر سیدنا ابو بکر کو بھی اپنے ساتھ شامل فرمایا۔) چنانچہ فرمایا:

لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا (سورۃالتوبۃ:۴۰)۔

ترجمہ: جب اپنے یار سے فرماتے تھے غم نہ کھا بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

ہمارے ہاں یہ قول سیدنا ابو بکر کے لیے ہے جس کی تائید ہمیں حضور ﷺ کے اس قول سے ہوتی ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

لو کنت متخذا خلیلا اتخذت ابابکر خلیلا۔ سیرت سیدنا ابو بکر صدیق، مشتاق بک کارنر لاہور۔

ترجمہ: ''اگر میں کسی کو اپنا خلیل بناتا تو ابو بکر کو اپنا خلیل بناتا''۔

رسول اللہ ﷺ کسی کے مصاحب نہیں تھے، بلکہ (صحابہ آپ ﷺ کے مصاحب تھے اور ایک دوسرے کے مصاحب بھی تھے۔ صحابہ آپ کے انصار واعوان تھے، پس ہمارے اشاروں پر غور کرو، یقیناً یہ اشارات راہ حق کی طرف رہنمائی کریں گے۔

لطیفہ

الرحیم کے دونوں نقطے دو قدموں کا مقام ہیں، ان میں سے ایک نعلین اتارنا امر و نہی ہیں اور الف مبارک رات لیلۃ القدر ہے اور یہی حضرت محمد ﷺ کا غیب ہے۔ پھر امر و نہی کی طرف اس رات میں تفریق کی گئی ہے، اس کی بنیاد اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ (سورۃالدخان:۴)۔

ترجمہ: ''اس میں بانٹ دیا جاتا ہے ہر حکمت والا کام''۔

چنانچہ یاء کرسی ہے، حاء عرش ہے، میم اس کا ارد گرد ہے، الف حدِ مستوی ہے، را قلم کی آواز ہے اور نون وہ دوات ہے جو لام میں ہے۔ پس لوحِ رحیم کے قرطاس میں وہ سب کچھ موجود ہے جو ہوا تھا، ہونا تھا اور ہوگا، اسی کو لوح محفوظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کتاب عظیم میں شارہ ہے کہ اس کتاب میں ہر چیز لکھی ہوئی ہے۔

چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

وَ كَتَبْنَا لَهُ فِي الْأَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ (سورۃ الاعراف:۱۴۵)۔

ترجمہ: اور ہم نے اس کے لیے تختیوں میں لکھ دی۔

یہ لوح محفوظ ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا:

مَوْعِظَةً وَتَفْصِيلًا لِكُلِّ شَيْءٍ (سورۃ الاعراف:۱۴۵)۔

ترجمہ: ہر چیز کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل۔

یہ لوح محفوظ جامع ہے اور حضور ﷺ سے آپ کے فرمان میں یہی بات منقول ہے:

اوتیت جوامع الکلم موعظۃ وتفصیلا۔

ترجمہ: "مجھے جوامع الکلم، نصیحت اور تفصیل عطا کی گئی۔"

پس رحیم کے دونوں نقطے ہر چیز کے لیے امر و نہی ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا غیب وہ الف ہے جس کی طرف مبارک رات کا اشارہ ہے، پس الف علم کے لیے اور وہ مستوی ہے، لام ارادہ کے لیے ہے اور وہ نون یعنی دوات ہے، راء قدرت کے لیے ہے اور وہ قلم ہے، حاء عرش کے لیے ہے، یاء کرسی کے لیے ہے اور میم کا سر آسمان کے لیے ہے اور میم کی جڑ زمین کے لیے ہے۔

پس یہ سات ستارے ہیں،ان میں سے ایک ستارہ جسم کے فلک میں تسبیح پڑھتا ہے اور ایک ستارہ نفس کے فلک میں کلام کرتا ہے ،ایک ستارہ سرِ نفس کے آسمان میں ہے اور وہ صدیقیت ہے ،ایک ستارہ قلب کے فلک میں ہے اور ایک ستارہ عقل کے فلک میں ہے اور ایک ستارہ روح کے فلک میں ہے۔

ہم نے جو دل پر تالالگایاہوا ہے اب اسے کھولنا چاہیے اور اس میں ہم نے اپنے مافی الضمیر کی چابی بھی مقرر کی ہے،پس اگر ہم وہ چابی طلب کریں گے تو اللہ نے چاہاتو پالیں گے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا جملہ قرآن کریم میں متعدد بار آیا ہے (ایک سو چودہ مرتبہ،ہر سورۃ کے شروع میں ، سوائے سورۃ التوبۃ کے ، جبکہ سورۃ نمل میں دو مرتبہ آیا ہے) مگر جب اس جملے کو حقیقی طور پر دیکھا جائے تو وہ ایک ہی ہے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا محمد و الہ و صحبہ اجمعین بر حمتک یاارحم الراحمین۔

حررہ:

العبد الفقیر السید احمد علی شاہ ترمذی حنفی سیفی

حال فقیر کالونی اورنگی ٹاؤن

جامعہ امام ربانی مجدد الف ثانی رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ